جلد (۳) ۔ جون سنہ ۱۹۰۲ء ۔ نمبر (۳)

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی۔ اے

# مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ




## مضامین نثر


نقش ارژنگ ۔ ایڈیٹر — ۱

زبان و قلم ۔ مولانا سید محمد علی صاحب اشہری (اناوہ) — ۷

مشک ۔ مولوی غلام یسین آہ دہلوی (کلکتہ) — ۱۴

گناہ ۔ مولوی محمود خاں شیرانی ۔ (ٹونکی) — ۲۳

جلسۂ احباب ۔ میرزا نذیر حسین احمد صاحب بی۔ اے — ۳۴

شاہ محمد عبد العلیم ۔ آسی ۔ مولوی عبد الصمد صاحب (غازی پور) — ۳۷


## مضامین نظم


سیر صبح ۔ حافظ سعید

فضل حق آزاد (پٹنہ) ۴۱

صدائے درد ۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۴۴

چاندنی رات ۔ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی ۴۶

کسی کا دھیان ۔ میر نیرنگ بی۔ اے ۴۸

حالی ۔ صادق علی خاں (سری نگر) ۴۹

انسان فانی ۔ قریشی علی مردان صاحب منظر ۵۱ + چکول ۵۳


نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں ۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی۔ اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

# مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور مضمون نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد دیسی اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے - یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جنکو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اسکے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں - اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کم از کم دوچار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کیطرف سے نہ ہوں مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں - اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو + رسالہ کا حجم (۲۲×۱۰) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے - **قیمت** عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ - اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ ہے - اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا - محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۶ آنہ سالانہ ہے +

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہیے - مابعد کا کوئی حساب نہیں - نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں - **شیخ عبد القادر** مالک و ایڈیٹر

# شرح اجرت اشتہارات

**مخزن** اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے - اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی ہیں اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی - اضلاع دکن اور حیدرآباد میں بھی بکثرت بکتا ہے - اور وہاں کے امراء اور رؤسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے - شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی اس کی فہرست میں شامل ہیں - اس لئے اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ کرسکینگے ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں - اجرت اشتہارات فی صفحہ سال بھر کے معاہدہ کے لئے مبلغ ۳۰ - ششماہی کے لئے ۱۶ اور سہ ماہی کے لئے ۹ روپیہ - فی نصف صفحہ سال بھر کے واسطے ۱۶ روپیہ ششماہی کے لئے ۹ اور سہ ماہی کے لئے ۵ - اتفاقی اشتہارات کے لئے ۲ آنہ فی سطر اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں - **شیخ عبد القادر** مالک و ایڈیٹر -

# مخزن

## نقشِ ارژنگ

اس گئے گذرے زمانے میں بھی خاکِ پاک ہند سے ایسے ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوتے ہیں کہ عقل اُنکے کام کو دیکھ کر دنگ رہجاتی ہے۔ یُوں تو اہلِ کمال کو ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ناقدردانی زمانہ کی شکایت رہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ شکایت زیادہ زور سے پائی جاتی ہے۔ اور اندنوں بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ فنونِ لطیفہ کے کمال کی قدر اس مُلک میں اب بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی قدر کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ملک میں روپیہ کا مینہ برس رہا ہو۔ اور سونا چاندی کسی کی نظر میں کچھ مال نہ ہو۔ ایسی صورت میں خواہ مذاقِ قدردانی نہ بھی بڑھا ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ ملک کے امرا طلبِ شہرت و ناموری میں اہلِ فن کو انعام و اکرام دیتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک کا تموّل چاہے معمولی درجہ کا ہو۔ مگر ملک میں مذاقِ فن اس درجہ پر ہو۔ کہ لوگ جی جامہ بیچ کر بھی اہلِ فن پر نثار کریں۔ ہندوستان میں نہ تو تموّل کی وُہ حالت ہے اور نہ مذاق کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے سامان۔ پھر فنونِ لطیفہ بڑھیں تو کیونکر بڑھیں۔ ہر قبرستان میں کئی خفتگانِ خاک ایسے ہیں۔ جو مشاہیر زمانہ میں ہوتے اگر انہیں حالات مساعد مل جاتے۔ مگر چونکہ زمانہ نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ زمانہ سے بیزار ہو کر کُنجِ لحد میں ہم آغوشِ حسرت و حرمان ہو گئے ہیں۔ اُس کثیر تعداد کے علاوہ جو اس طرح دنیا میں آتے اور غنچہ ناشگفتہ کی طرح بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں۔ کئی اہلِ کمال ایسے بھی ہیں جن کی

طبیعت کی رنگینی گُل کھلاتی ہے۔ گلوں میں رنگ بھی ہوتا ہے اور بُو بھی ہوتی ہے۔ مگر وُہ رنگ کسی قدردان کی آنکھ کو تازگی نہیں بخشتا اور وُہ بُو کسی ذی فہم دماغ کو معطر نہیں کرتی۔ گُل کھلے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں۔ تختۂ گلاب مہک رہا ہے۔ اور کوئی خوشبو لینے والا نہیں۔ ایسے اہلِ کمال اس پریشان حال اور معتوبِ روزگار دیار کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور انکی حالت بالعموم ایسی ہے کہ بے اختیار فنِ شعر کے ایک اُستاد کا یہ پُر درد شعر زبان پر آتا ہے :-

یُوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال۔ افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے۔ تجھ پر کمال افسوس ہے

حیدرآباد دکن باوجود اُس شہرت کے جو قدردانیٔ اہلِ فن میں اسے حاصل ہے۔ اور بجا حاصل ہے۔ کئی ایسے آشفتہ حالوں کا مخزن ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سرکارِ نظام نے (خدا اس سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے) عبّاسیوں کی فیاضی اور قدردانیٔ علم و ہنر کی شہرت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور کئی باکمال اس سرکار کی توسّل سے کامل ہو گئے ہیں۔ ورنہ مایوسی اُن کے زورِ طبیعت کو بجھا دیتی۔ اور وُہ کئی اپنے جیسے طبّاع مگر بدقسمت آدمیوں کی طرح گنجِ گمنامی میں پڑے رہتے۔ مگر یہ بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ وہیں بہت لوگ ایسے ہیں جو یا تو نگاہِ لطفِ سرکار سے محروم رہے ہیں۔ یا اگر نگاہ اُنپر پڑی بھی ہے تو ادھوری پڑی ہے۔ اور اُن پر وُہ عنایات نہیں ہوئیں۔ جو اُنکے کمال کے متناسب ہوں۔ یا جن سے وُہ اپنے فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر پوری توجّہ سے اپنے فن کو رونق دے سکیں۔ یُوں تو مختلف علوم و فنون کے جاننے والے وہاں پڑے ہُوئے ہیں۔ اور اُن سب کے کمال کے نمونے اپنے اپنے رنگ میں خاص خوبیاں رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمارے تصوّر میں فنِ خطّاطی کے کمال کا ایک نمونہ ہے جس کی ایک جھلک اتّفاق سے دیکھنی نصیب ہُوئی تھی۔ اور جس کا نقش ذہن میں اس

خوبی سے جما ہے ۔ کہ مٹاتے سے نہیں مٹتا ۔ اور اسی کا نام ہم نے نقش ارژنگ رکھا ہے اور ہم کیا رکھینگے ۔ خود سعدی شیرازی نے اس نام پر صاد کیا ہے ۔ یہ نقش ارژنگ ایک آئینہ ہے ۔ جس کا طول ۲¾ فیٹ اور عرض ۱½ فیٹ ہے ۔ اس آئینہ پر اُستاد نے ایک درخت کریدا ہے ۔ جو بہ حیثیت شجری نہایت پیارا اور خوشنما شجر ہے ۔ چوٹی سے لیکر تنہ تک ایک مکمل شجر ہونے کی شان آشکار ہے ۔ کیا ڈال کیا پات نیچر کے مطالعہ کا پتہ دے رہے ہیں ۔ اس شجر کے سایہ میں ایک خوبصورت عرب گھوڑا کھڑا ہے ۔ اور کہا جاتا ہے ۔ کہ یہ گھوڑا حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے تازی گھوڑے کی صحیح تصویر ہے ۔ درخت کی ٹہنیوں پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے پرندے بیٹھے ہیں ۔ کوئی اُڑنے کو پر تول رہا ہے ۔ کوئی اُڑتا ہوا آرہا ہے اور آکر ستا رہا ہے ۔ کسی کی حالت سے کلیلیں ٹپکتی ہیں ۔ ایک کونے میں ایک بلّی دبکی ہوئی بیٹھی ہے ۔ اور گھات میں ہے کہ کسی پرند پر جست کرے ۔ ایک آدھ پرند کی صورت پر جس سے بلّی کی آنکھ لڑ گئی ہے ۔ سہمے ہوئے ہونے کے سب آثار نمایاں ہیں ۔ یہ پرند تعداد میں گیارہ ہیں ۔ اور ایک گوشہ میں یہ موزوں مصرع انکی موزونیت کی داد دے رہا ہے ۔ "دَوْحَۃٌ بجمع طَیرُہا موزُون" مگر سب سے بڑی بات جو اس نقاشی میں دکھائی گئی ہے اور جو دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ درخت اور یہ جانور ملکر سالم گلستاں ہیں ۔ یعنی سعدی کی گلستاں کے سارے باب نہایت باریک اور خوشنما خط میں لکھے ہوئے ہیں ۔ اور اسی لکھائی کے الفاظ ملکر اس شجر کی شاخیں اور پتّے اور ان پر بیٹھنے والے پرند بنتے ہیں ۔ اور سعدی ہی کے دو شعر زیب عنوان ہیں ۔ اور اس آئینۂ حیرت انگیز کیطرف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ سعدی نے انہیں اسی کے واسطے لکھا تھا وہ شعر یہ ہیں :۔

گر التفات خداوندیش بیار آید     نگار خانۂ چینی و نقش ارژنگیست

اُمید ہست کہ رُوئے ملال در نکشد ازیں سبب کہ گلستاں نہ جائے دلتنگیست

باوجود باریک ہونے کے تحریر میں یہ خوبی ہے کہ اسکا بہت سا حصہ تو بغیر کسی مصنوعی مدد کے صاف پڑھا جاتا ہے اور جو زیادہ باریک ہے وُہ کلان نما شیشہ کے ذریعہ سے پُورا واضح ہو جاتا ہے۔ صاحبِ فن کے فن کا اندازہ اصلی طور پر اسی باریک حصّہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ کلان نما شیشہ کے ذریعہ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بظاہر نظر کام بھی نہیں کر سکتی وہاں بھی حروف کے دائرے ایسے ہی موزون اور درست ہیں جیسے اُن مقامات میں جہاں ذرا جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ اور تناسب حروف میں کہیں فرق نہیں آنے پایا۔ اس سے پہلے اسی باکمال نے اِس سے ذرا چھوٹے پیمانے پر یہ فن دکھایا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کی ایک سو انچ عمری اِس شیشہ سے ایک چھوٹے شیشہ پر لکھی تھی اور وُہ شیشہ بموقع جوبلی ملکہ معظمہ کو بھیجا گیا تھا وہاں سے پروانہ اظہار خوشنودی مزاج آیا تھا۔ اُس زمانہ میں الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار پایونیر نے بھی نہایت پُرزور الفاظ میں اس فن کی داد دی تھی اور سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اپنی بےنظیر جوہر شناسی کا ثبوت دیا تھا۔ معمولی اخباروں کا تو کیا ذکر وُہ تو مدّتوں مدح سرائی کرتے رہے ہونگے۔ کسی اور ملک میں کسی صاحبِ فن کا یا اُس کی کسی ساخت کا ایسا چرچا ہوتا تو وُہ غالباً اب تک مالا مال ہو چکا ہوتا اسی قسم کے کام تیار کرنے کی سینکڑوں فرمائشیں اُس کے پاس پہنچ جاتیں اور وُہ مجبور ہوتا کہ اپنے شاگرد بنا کر اُن سے کام لے اور فن کی ترویج مزید کا باعث ہو۔ مگر یہاں تعریفیں خواہ کسی مصنّف کی ہوں۔ کسی مشہور فصیح کی ہوں۔ کسی مدبر ملک کی ہوں۔ کسی مصوّر کی ہوں۔ کسی نقاش کی ہوں یا کسی اور فن کے ذی کمال کی ہوں۔ عارضی ہوتی ہیں اور محض زبانی۔ اُن سے کوئی مقصد فائدہ صاحبِ فن کو نہیں پہنچتا اور خلق خُدا جلد اُن تعریفوں کو بھول جاتی ہے

اور دُنیا جلد اُن لوگوں کو فراموش کر دیتی ہے - جن پہ ایک فوری جوش کے اثر سے یہ واہ واہ اور مرحبا کے ہزاروں پھول برسانے کو تیار تھے - ہمارے ہاں اکثر باکمالوں کو انکی محنت اور عرقریزی کا صلہ اسی زبانی تحسین و آفرین سے ملتا رہا ہے اور اُن میں سے بعض اپنی قانع طبیعت کی بدولت اسی کے نشہ میں مست رہے ہیں - چنانچہ امیر مینائی مرحوم لکھتے ہیں :-

شاعر کو دِل سے بھاتی ہے تحسینِ شعرِ امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

مگر یہ فرضی اور خیالی نشہ اور تصور کے لہلہاتے ہوئے سبز باغ اس زمانہ میں کسی کو دیر تک سہارا نہیں دے سکتے تاوقتیکہ وُہ بالکل تارک الدنیا نہ ہو جائے اور امیر جیسا فقیر منش صوفی مزاج کنج قناعت کا عادی آخر واہ واہ کی بوتلوں کے نشہ سے سیر ہو کر اُس نشہ کی تلاش میں وطن سے نکلنے پر مجبور ہوا جس کے ڈوروں سے ابیض منقوش کی دید آنکھوں کو میگون کر دیتی ہے -

وُہ تو اپنی ذات سے آدھی چھوڑ کر ساری کی طرف دوڑنے والا نہ تھا - مگر امیر اللغات کی سی ضخیم اور تحقیق طلب تصنیف اُس ہوائی جنس سے جسے تحسین و آفرین کہتے ہیں تیار نہیں ہو سکتی تھی اور اُس کے واسطے زر سے بہرا کیسہ درکار تھا - اُس نے سارے ہندوستان پر نظر دوڑائی اور دکن کے سوائے کہیں بھی اُسے جائے اُمید دکھائی نہ دی - گیا اور چلتے چلتے یہ پیشینگوئی کرتا گیا -

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے - مجھ کو

وہاں پہنچتے ہی اُس کے بیمار ہونے اور دنیا اور مشاغل دُنیا سے رخصت ہونے کا دردناک واقع ابھی ایسا تازہ ہے کہ اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں -

غرض اس سے صرف یہی ہے کہ اہلِ ملک اور خصوصاً رؤسائے اور اُمرا کو اُن کا یہ اہم فرض یاد دلایا جائے کہ اپنے ہاں کے باکمالوں کی قدردانی عملی طور پر کریں۔ پیشتر اس کے کہ قدردانی کا موقع انکے ہاتھ سے نکل جائے۔ اور اِن لوگوں کی حوصلہ افزائی سے نہ صرف مُلکی علم و ہنر کو ترقّی دیکر اہلِ ملک کو ممنون کریں بلکہ اپنے واسطے جہانِ باقی میں وہ دولت جمع کرلیں جسے نہ کیڑا کھائے گا نہ گھُن لگیگا۔ خصوصاً دکن پر جس سے ہندوستان میں گذشتہ اسلامی عظمت و شان کا نشان ملتا ہے ہر فن کے اہلِ کمال کے بہت حقوق ہیں اور جو سلوک آج تک صاحبانِ کمال کے ساتھ وہاں ہوا ہے اُس کی توسیع کی بہت کچھ ضرورت ہے +

---

**بچوں کا اخبار۔** منشی محبوب عالم صاحب مالک و ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ لاہور کی جدت پسند طبیعت کا تازہ ترین نتیجہ ایک "بچوں کا اخبار" ہے۔ جسوقت سے اسکی تجویز کا اعلان بذریعہ پیسہ اخبار ہوا ہے۔ اسکی مانگ جاری ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ ضرورت کی چیز ہے۔ ہر گھر میں بچے ہیں اور اُن میں کوئی نہ کوئی پڑھتا ہے۔ انکے لیے درسی کتابوں کے علاوہ کوئی علمی تفریحی مشغلہ ڈھونڈھو تو ہندوستان بدیں وسعت اس کو مہیا کرنے سے عاجز ہے۔ اس ضرورت کو منشی صاحب نے نہایت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے اب جب یہ چیز تیار ہو کر ہمارے سامنے موجود ہے تو خیال آتا ہے۔ کہ آج تک کیوں نہ تھی۔ یہ خیال کہ بچوں کے لیے ایک خاص رسالہ یا اخبار ہو طبیعت سے ایسا مانوس معلوم ہوتا ہے۔ ہاں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ اخبار سردست ایک ماہوار رسالہ کی صورت میں ہے۔ جو ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر ماہ بماہ شائع ہوا کریگا۔ اسکی ظاہری صورت دلکش بنانے میں بھی پوری کوشش کیگئی ہے اور اسکے مضامین بھی دلپذیر ہیں۔ اور خصوصاً اس جماعت کے لیے جس سے یہ مخصوص ہے دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کیگئی ہے۔ جا بجا لیتھو کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ لطیفے بھی ہیں معمّے بھی ہیں۔ کہیں کہیں نظم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے درج ہیں جن سے مفید نصائح کی سبق حاصل ہوتے ہیں۔ غرض کئی پہلوؤں سے اُردو زبان میں یہ اپنے رنگ کا نرالا پرچہ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے

# زبان اور قلم

(از مولانا سید امجد علی صاحب اشہری)

دُنیا میں یہی دو چیزیں ہیں جو ہزاروں برس گذشتہ کے آثار اور واقعات کو ہمارے سامنے لا رہی ہیں۔ اور انہیں سے ہم آیندہ ہزاروں برس اپنا قومی یادگار قائم رہنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اور آج کل انہیں دو چیزوں پر ہماری ہر قسم کی سوشل اور پولیٹیکل زندگی اور ترقی منحصر اور موقوف ہے۔ زبان سلطنتِ جسمانی کی وزیر اور بیان سلطنتِ روحانی کا سفیر ہے۔ زبان دیکھنے میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ لیکن انسان کا کوئی جُزوِ بدن مثل زبان کے ہر شے پر محیط و متصرف نہیں۔ زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وُہ مثل ہَوا کے بسائط میں داخل ہیں۔ لیکن آپ غور تو کریں کہ اُن کی بساطت سے مادی چیزوں کی کیسی عجیب و غریب تکوین و اصلاح ہوتی ہے۔ اور یہ قدرتی فوٹوگراف نیچر کے کیا کیا اسرار ظاہر کرتا ہے اور ۳۲ حرفوں کی آوازوں اور اُن کی مختلف ترکیبات سے روزمرہ کی زندگی اور سائنس پر کیسا عجیب اثر پڑتا ہے جو قدرت کا ایک صریحی معجزہ نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی آسمانی کتاب میں ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ یعنے ہم نے آدمی کو بنایا اور اسکو بات کرنا سکھایا۔ گویا یہ صفت گویائی اُس کی قدرتِ آفرینش کا ایسا عجیب نمونہ ہے جس پر صانعِ حقیقی بھی ناز کرتا ہے۔ زردشت کے اقوال میں ہے کہ زبان معجزۂ قدرت ہے۔ ہندوؤں کا وید مقدس زبان کو برہما کے خزانوں کی کنجی بتاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی مسیحائی زبان سے وابستہ نظر آتی ہے۔ جرمن کے ایک حکیم نے پوری کتاب زبان کی لاثانی اور بیمثل طاقتوں پر لکھی ہے اور ثابت کیا ہے کہ کوئی طاقت اس سے لگا نہیں کھا سکتی۔ آنریبل سرسیّد کی زبان سے جو کام ہوا وُہ

آپ کے سامنے ہے۔ نپولین زبان کی طاقت کو طاقتِ عظیم کہا کرتا تھا۔ حکیم نصیر الدین طوسی زبان کی فلاسفی کو اسرارِ حکمت کے عجائبات میں بتاتا ہے۔ ارسطو کے اقوال میں ہے کہ میں قدرت کے اس عجیب و غریب آلہ جرِ ثقیل کی طاقتوں کی انتہا نہیں بتا سکتا۔ لقمان نے زبان کی نسبت فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام خزائنِ قدرت کی کنجی ہے۔ انگلستان کی ہوس آف کامنز اور ہوس آف لارڈز میں جو باتیں زبان کی طاقتوں سے سرانجام پاتی ہیں۔ وہ خاص طور پر محلِ غور ہیں۔

مبارک وہ قوم جس میں ایسے عالی درجہ نطق آرا پیدا ہوں۔

اور آفرین اس قوم کو جو زبان کی ایسی عزت کرنے والی ہے۔

زبان کے بعد قلم کی طاقت کو تلوار کی طاقت سے زیادہ پُر اثر مانا گیا ہے۔ دنیا میں ہم سیکڑوں مشینیں دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ دمڑی کی مشین بھی ایسی عجیب ہے جو ہر وادی میں ایک پاؤں سے دوڑنے کو آمادہ اور ہر بات کی تصویر اتارنے کو دلدادہ نظر آتی ہے۔ پرانے زمانہ کو اس سے بڑھ کر کیا فخر ہوگا۔ جس نے زبان کی نقل اور اسرار نیچر کے اظہار اور طرح طرح کے نقوش اور بقاء یادگار کو ایسا عجیب آلہ اس ارزانی کے ساتھ ایجاد کیا۔ اگر ہم دنیا کی بڑی بڑی عالیشان مشینوں کے مقابل اپنی اس دمڑی کی مشین کو سامنے لائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کام اس مشین سے نکلتے ہیں وہ اس کا حصہ ہیں ؎

ہے لوح و قلم اوّل مخلوقِ الٰہی — آباد اسی سے ہے ہوا کشورِ شاہی
ہیں اس کے شرف لاتعد و لا تناہی — قرآں میں فضیلت پہ قلم کی ہے گواہی
دیکھو تو قلم فاتحِ اقلیم جہاں ہے
مثل اس کے بتاؤ کوئی فتاح کہاں ہے

ہماری دانشمند گورنمنٹ نے جس قابلِ قدر طریق سے قلم سے کام لیا وہ تلوار کی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط اور بااثر پایا جاتا ہے۔ ایشیائی لٹریچر میں قلم کو بادشاہ کا ہم مرتبہ

مانا گیا ہے۔ ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم

یورپ کے رسائل اور اخبار قلم کی طاقت سے وہ کام لے رہے ہیں جو تلوار کی طاقت سے سرانجام پانا دشوار ہوں۔

کبھی ہماری قوم بھی شمشیر و قلم دونوں کی مالک تھی لیکن افسوس کہ اب وہ دونوں سے دور اور بہت دور ہوتی جاتی ہے۔

اِس امر کا فیصلہ کہ ہماری قوم سے تلوار اور قلم دونوں نکلے ہوئے ہیں۔ تھوڑے غور میں ہوسکتا ہے۔ تلوار کا یہ حال ہے کہ بغیر لیسنس کے ٹین کی تلوار نہیں باندھ سکتے۔ اب رہا قلم اس کو جب آپ یورپ کے آہنی مین کے سامنے لائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی ہیچ ہے۔

یورپ کے ایک معمولی اخبار اور رسالہ کے برابر ہمارا کوئی اعلیٰ اخبار اور رسالہ نہیں۔ یورپ کی ایک عام تصنیف ہماری خاص تصنیف سے بالاتر ہوگی۔ یورپ میں تصنیف کے لئے جو سرمایہ موجود ہے اُس کا یہاں پتہ نہیں۔ یورپ میں ایک ایک بات کی تحقیق میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو جانا معمولی بات قرار پاگیا ہے۔ ہم کس برتے پر علم طبقات الارض جغرافیہ ہیئت طبعیات کی چھان بین کریں۔ یورپ میں سیکڑوں عالم اپنی قوم کی متعدد زبانوں میں مختلف مقامات پر لکچر دیتے ہوئے پائے جائیں گے جن سے خواہ مخواہ اذہان کو کسی جانب رجحان اور قلوب میں ترقی کا میلان پیدا ہو۔ یہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہ کچھ داستان گو امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی داستانیں کہتے ہوئے نظر آئینگے۔ بڑی معراج یہ کہ سالتمام پر نواب محسن الملک اور مولانا نذیر احمد کی زبان سے کچھ سُن لیں۔

حال میں انگلستان کے ایک سوداگر سسل رہوڈس نے افریقہ کی جائداد سے نو کروڑ روپیہ تعلیمی وظائف کے لئے وقف کیا۔ ہم ہیں کہ اپنے ہونہار بچوں کو دس روپیہ مہینہ کا وظیفہ نہیں دے سکتے۔ یورپ کے اخباروں میں مضمون لکھنا درشنی ہنڈی کا

کام دیتا ہے۔ یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون نگار صرف اخلاقی شکریہ پر آداب بجالاتے ہیں۔ وہاں ایک ایک اخبار اور معمولی کتاب کی لاکھوں کاپیاں بک جانا آسان۔ یہاں تمدنِ عرب۔ حیاتِ جاوید۔ الفاروق۔ البرامکہ جیسی کتابیں خریداروں کا منہ تک رہی ہیں۔ پھر ہم کیونکر کہیں کہ ہم صاحبِ قلم ہیں۔ ہاں جیسے گرتے پڑتے ہم اپنی زندگی کاٹ رہے ہیں ویسے ہی گڑگڑاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے ہماری زبان بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ اور جس یاوسی سے ہم اپنی ترقی کی اُمید کرتے ہیں۔ اُسی افشردہ دلی سے اپنی زبان کی بہتری کی بھی اُمید کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی جب ہے کہ جیسے قوم میں قومی ترقیات کے لئے کچھ نہ کچھ کوشش ہو رہی ہے ویسے ہی قومی زبان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ زندہ دلی کے اسباب پیدا کئے جائیں۔

شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال

مسلمانوں کی مروجہ زبانوں میں عربی اور فارسی نے اپنے ادائے کلام کو اصول و عروض مقرر کئے۔ نثر میں مرجز۔ مسجع۔ عاری اور نظم میں قصیدہ۔ غزل مثنوی وغیرہ کے لئے قواعدِ خاص نافذ ہوئے۔ اقسامِ کلام کے کھرے کھوٹے پرکھنے کو معیار بنائے گئے اور اقسامِ نظم کی ناپ تول کو ترازوئیں مقرر کی گئیں۔ لیکن اب تک اردو کے سب معیار ناقص ہیں اور اُردو میں درجاتِ امتیازی کا بھی حصر و انضباط نہیں۔ اُردو میں اہلِ کمال کے مناظرات کی جگہ اولڈ فیشن اور نیو فیشن کی ترکیبِ کلام ایک تفاوتِ خاص ظاہر کرتی ہے۔ جو بات وہاں حلال ہے وہ یہاں حرام ہے اور جو یہاں جائز ہے وہ وہاں مکروہ ہے۔ میرے نزدیک اُردو کی ترقی قوم کی ترقی سے زیادہ مشکل نظر آتی ہے۔ کیونکہ اُردو کی ترقی کے لئے عربی اور فارسی کا علامہ اور انگریزی کا آل۔ آل ڈی ہونا ضرور ہے۔ جو اُس کے مقاصدِ ترقی کی تدوین کرے۔ اور اسکی بات قبولیتِ عام کا اثر رکھنے والی ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ ایسے لوگوں کو قیامت کی نیند سُلا رہا ہے

اور قوم میں جو تعلیم یافتہ پیدا ہو رہے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی اور معمولی طور کی اُردو جانتے ہیں۔ جو زبانِ اُردو کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ پس ہندوستان میں عربی اور فارسی کا زوال تکمیلِ زبانِ اُردو تک اُردو کے لئے سخت مصیبتناک امر ہے۔ جو نامعلوم طریق سے اُردو کا کام تمام کر رہا ہے۔

اُردو کے عالیشان ایوان میں بجائے اس کے کہ علوم و فنون کے وسیع اور پائدار کمرے بنائے جائیں۔ آرایش کا سامان اضافہ ہو رہا ہے۔ اور فرنیچر کی وہ کثرت ہے کہ ایک ایک درجہ میں بڑے بڑے جھاڑ لٹکتے نظر آتے ہیں۔ اور لیمپوں اور فانوسوں کی تو گنتی نہیں۔ تمدن عرب حیاتِ جاوید الفاروق المامون الہارون مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ البرامکہ وغیرہ وغیرہ سب اسی فرنیچر کے شمار میں ہیں۔ علمی تصنیفات میں اُردو نے اب تک نصاب تعلیم بھی پورا نہیں کیا۔ مولانا نذیر احمد صاحب نے منطق میں کچھ لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہگیا۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے طبعیات میں کچھ لکھا اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑا ضروری کام کیا لیکن ابھی وہ سلسلہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ اور مولانا نے اُس کتابی سلسلہ کو چھوڑ کر متفرق طور سے زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیئے۔ کہیں آپ نے ایک مضمون لکھ بھیجا کہ فضائے لامتناہی میں ایک گولہ چھوٹا تھا اس سے سورج نکل بھاگا اور کبھی کسی اخبار میں ایک آرٹیکل لکھ ڈالا کہ سورج سے ایک دہکتا ہوا انگارہ نکلا اور چلتے چلتے ٹھنڈا ہونے پر زمین بن گیا۔ لیکن افسوس کہ ایک مدت سے ایسے متفرق مضامین بھی شائع نہیں ہوتے۔ آنریبل سرسید احمد خان بہادر نور اللہ مرقدہ اور عالیجناب نواب محسن الملک بہادر کے لکچر اور اسپیچیں اُردو کا سرمایۂ فخر سمجھے جانے کا حق رکھتی ہیں لیکن ان میں بہت بڑا حصہ زوائد کلام کا ہے جو اس موقع و محل کے لئے اپنا کام نکالنے اور دُنیا کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے اختیار کیا گیا اور جو اس موقع پر

حُسنِ کلام کا کام دینے والا تھا لیکن کتابی حیثیت میں آنے اور لٹریچر کا اعلیٰ نمونہ کہلانے کے لئے اس کو ایک خاص انتخاب کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک ملک کو اخباروں کے بڑے بڑے طولانی آرٹکل پڑھنے اور اسکی تقلید میں مضمون آرائی کرنے سے طول کلام کا ایک عام مرض پیدا ہوتا جاتا ہے جو یورپ کے سزاوار ہے لیکن ہمارے حسب حال نہیں۔ یورپ میں بڑے بڑے تختوں پر روزانہ اخبار نکلتے ہیں اور باریک ٹائپ سے چھپتے ہیں۔ اور مضمون نگاروں کو مضامین کے خاطر خواہ دام ملتے ہیں۔ اِس لئے دونوں کو اس امر کی ضرورت ہے کہ بات کو بڑھا کر کہنے اور اخباری کالموں کو لمبے لمبے مضامین سے بھرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے۔ لیکن یہاں خدا خدا کر کے آٹھویں دن اخبار نکلتا ہے اور ۲۰×۲۶ کی عام تقطیع آٹھ صفحہ سے سولہ صفحہ تک ہی جس میں ایڈیٹر اور پروپرائٹر اخبار نے تمام دنیا کے مضامین و مطالب اور سارے جہان کے اخبار جمع کرنے کا اشتہار دیا اور اپنے خریداروں سے اُسکا بیمہ کیا ہے۔ پس آٹھویں دن ان چند صفحات کو لمبے لمبے مضامین و تراجم سے بھر دینا اپنے ہاتھ سے اپنے کام کا بگاڑنا ہے۔ میرے نزدیک ہر ایڈیٹر اور مضمون نگار اور ہر انشاء پرداز کو اس امر کی پابندی کرنا ضرور ہے کہ عام طور سے جو مضمون ایک صفحہ میں آتا ہے اس کو خاص قابلیت سے ایک کالم میں لکھنے کی خواہش کیجائے۔ اور اس طور پر اُردو کی فضولیات کو کم کر کے اخبارات میں دوسری ضرورتوں کے لئے گنجائش نکالی جائے۔

اُردو میں مغربی تراجم سے بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مضمون جو کتابی صورت میں آنے چاہئیں ایک مرتبہ اخبار میں لکھ کر ردی کے ساتھ عطاروں کو دے دیئے گئے ہیں۔ اور اُنہوں نے اُنکو پڑیاں بنانے کے کام میں خرچ کیا ہے۔ دوسرے نامعقول ناولوں اور معمولی تراجم میں جو ہمیں کوئی فائدہ

نہیں پہنچا سکتے ملک کے اوقاتِ عزیز کا بڑا حصہ صرف ہوا۔ کاش تمام ہندوستان کے اردو خواں اور انگریزی دان ملکر انسائیکلوپیڈیا یا اسی درجہ کی اور کسی کتاب کا ترجمہ کر ڈالیں تو اس ملک کے لئے ایک لاثانی خزانہ پیدا کرنے والے ہوں۔ اور بقائے حروف تک اردو کا سرمایہ فخر سمجھا جائے۔ اور پھر اُس سے ایسے ایسے مفید سبق حاصل ہوں جو دوسرے ذرائع سے ناممکن ہیں۔

پنجاب کے زندہ دلو ! کیا تم ہمت کر سکتے ہو؟

علیگڈھ کے نوجوانو ! کیا تم اتفاق مشترکہ سے ایسا درخت لگا سکتے ہو جس کے سایہ میں آنے والی نسلیں تمہاری بزرگیوں کا اعتراف کرنے والی ہوں۔ اور یقین سمجھو کہ اب تمہاری سب ترقیاں صرف زبان اور قلم پر منحصر اور موقوف ہیں۔

فی زمانہ پنجاب میں ہر قسم کی ترقیات کا پتا ملتا ہے۔ وہاں اخباروں کی حالت بھی دوسرے مقامات سے اچھی ہے۔ اور طرّہ یہ کہ کل جس پنجاب پر دلّی اور لکھنؤ والے من حیث زبان ہنستے تھے وہ خدا کے فضل سے آج اُن کی ہمسری کا دعویٰ کر رہا ہے۔

اگر ہر حصہ ملک میں اردو کی نسبت ایسی ہی مشق جاری رہے تو چاروں طرف "تدوین کلام" کا ایک خاص سلیقہ پیدا ہو سکتا ہے۔

(اشہری از اٹاوہ)

# مُشک

صانعِ مطلق نے کارگاہِ ہستی کی ترکیب کے وقت اقسام اقسام طور کی اشیا اور حیوانات و نباتات بنا کر اپنی اعلیٰ درجہ کی دستکاری کا نمونہ دکھا دیا ہے۔ ہر ملک ہر دیار میں ایک نئی چیز اور ہر نئی چیز میں ایک انوکھی بات (اور وُہ بھی مفیدِ خلائق) قدرت کی پکار پکار کے صاف الفاظ میں گواہی دے رہی ہے۔ زیادہ تکلف ہر طرف صرف سادگی اور لطافت کے ہاتھوں نیچر نے ہر شئے میں وُہ دلفریبی کی بجلی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہے جس کی طرف ہر مذاق والے کا دِل کھنچا جاتا ہے اور جس کے ہر فریق والے ہمیشہ کے لئے دِل سے قدردان ہو رہے ہیں۔

مگر یہ سب کائنات کس کے لئے؟ صرف اِک حسنِ تقویم کا جوہر رکھنے والے انسان ضعیف البنیان کے لئے جو صانع کے شائستہ اور لاجواب ہاتھوں کی پُرکاری اور قدرت کی وسعت بتا رہا ہے۔ اور جسے ملاءِ اعلےٰ کی پرلی طرف سے ظلوم و جہول کی بے بہا سند ملنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ان ضعیف انسانوں کی رسائی کے صدقے اور قربان یہ نامِ خُدا ہر شئے تک پہنچکر (چاہے وُہ کتنی ہی انمل اور زبردست کیوں نہ ہو) حکمرانی کے علاوہ فطرتی بناوٹ اور خوبی کے مزے لُوٹ رہے ہیں۔ اور سادگی و لطافت کے سوا بے ساختگی کے سرور اور لُطف سے قابلِ قدر زندگی کے حصّے گذار رہے ہیں۔

وُہ کونسی چیز ہے کہ جس تک اُنکا کاٹ چھانٹ کرنے والا اور بُرے کو بھلے سے الگ تہلگ رکھنے والا ہاتھ نہیں پہنچا ہے۔ اُنہوں نے سرکش سے سرکش اور زبردست سے زبردست کو زیرِ فرمان کر لیا ہے اور زیرِ فرمان کئے جاتے ہیں۔ کہاں انسان کی جسمی حیثیت اور ضعف! اور کہاں دیگر مخلوقات کے قوی جُثّے اور قوت! مگر وُہ

قادرِ حقیقی جس کو چاہے فتح دیدے اور فضیلت - عقل حیران ہے اور طبیعت پریشان! واقعی یہ مقولہ درست ہو کہ "یضع اللہ سُبحانہٗ بالضعیفِ حتّٰے یتعجب منہُ القوی"۔

غرضکہ قُدرت کے عجائبات کی زندہ تصویر اور وُہ بھی دلکش و دلچسپ اُن کے دِل پر ہمیشہ سے فتحمندی حاصل کر چکی ہے یہ جو کچھ کر رہے ہیں فطرت کے جذبات نہ رکھنے کی حالت میں! یہ جو کچھ برت رہے ہیں آپ سے باہر ہو کر۔ جس کی بدولت آئے دن وُہ وُہ باتیں سوجھتی ہیں اور ہر کام کے عمدہ اور مفید ایسے ایسے طریقے ہاتھ لگتے ہیں۔ جنکا اندازہ غیر ممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہ اپنی طبیعت کے زور سے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی اچھّی شئے سے بُری کو جُدا کر دیتے ہیں۔ ہر چیز میں اچھائی کے نیک پہلو ڈھونڈھ لینے کے علاوہ کوئی بھی ایسی چیز چار حدودِ دہر اور اس نیلے شامیانے کے نیچے نہیں چھوڑتے جو دُنیا والوں کے لئے عمدہ اور فائدہ رساں یا کارآمد ہو! ان کی جد وجہد اور چھان بین کے سوا عقل کی رسائی کی پہلی مثال "مشک" اور خطائی ہرنوں کے بیان سے خصوصاً مشک دستیاب ہونے کے طریقے سے ہم دینا چاہتے ہیں جو دلچسپی کی دُنیا میں بے نظیر ہے۔ دار السلطنت پیچین[1] جو اقلیم خطا کے پہلے صوبے پیچیلی میں واقع ہے جسے اک زمانہ میں صحرانشین تاتاریوں نے زبردست اور قوی اہلِ خطا کے بلوۂ عام روکنے کی غرض سے "دار الامارۃ" قرار دیا تھا۔ اس کے مغرب کی سمت پہاڑوں کی باقاعدہ قطار نے نافہ دار ہرنوں کو آسائش سے سکونت کا موقع دیا ہے۔ اُن کی فطرت عام ہرنوں کے ہمراہ بود و باش اور اُنکے ساتھ ساتھ رہنے کی مطلق اجازت نہیں دیتی ہے ایسی اُونچی اُونچی چوٹیوں پر انکے رہنے کے مکانات بنے ہُوئے ہیں۔ اور یہ ان میں نہ صرف رات ہی کا ہیبت ناک اور تاریک وقت کاٹتے ہیں بلکہ دن کا بھی ایک بہت بڑا حصّہ گذارتے ہیں۔ جہاں انسان تو انسان طائرِ خیالِ انسان بھی پر نہیں مار سکتا ہے۔

[1] دیکھو مسٹر جیمز کارکرن صاحب کی ہسٹری ۔

اور جہاں کی رسائی کے خیال سے درندوں کے دل دہلے جاتے ہیں اور پرندوں کے کلیجے منہ کو آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جس نے اُن کی تمام عادتوں اور خصائل کے من وعن فوٹو کھینچنے سے باز رکھا۔ ان کی حرکات اور سکنات اور طرزِ معاشرت کی کماحقہٗ تحقیق نہ ہو سکی

**ہرنوں کی ڈیل ڈول**

اہل تبت اور وحشی تاتاریوں کے علاوہ خطا والے بھی بیان کرتے ہیں کہ ان ہرنوں نے کچھ تو عام ہرنوں کا قیافہ اڑایا ہے اور کچھ سیدھی سادی بکریوں کا! مگر لطف یہ ہے کہ جسم کے بچانے کی ڈھالیں جنہیں عام طور پر "سینگ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ انکے گول مول سروں سے اُتنا ہی دُور ہیں جتنا یہ دُنیا والوں سے! نر اور مادہ دونوں اس بکار آمد شئے سے بے بہرہ۔ ڈیل ڈول میں بجز بنگالے کی غریب اور مظلوم بکری کے نہ ہرنوں سے مناسبت نہ کسی اور جانور سے۔ اک یونہی سا جسم پایا ہے جو سبک روی میں مشاق اور کیسا مشاق؟ جسے ہوا یا بجلی سے تشبیہ دینی مطلق مبالغہ نہ ہوگا۔

ان ہرنوں کے مادے مشک سے یکلخت محروم ہیں مگر خیر سے نروں کے مقامِ ناف میں ایک چرمی تھیلی ہے۔ جسے مشک کی سکونت کا شرف حاصل ہے اور جو اپنے مادوں کے مقابل زائد حالتِ بیم میں ہیں اور جن کی عزیز جانیں جوکھم میں!

یورپ کے جہاں گرد اور سیاح پادری جو صرف سیر و سیاحت کی نذر ہو چکے ہیں اور جو فرنگستان سے قدم نکال کر دنیا بھر کی سیر سے سیر نہیں ہوتے ہیں۔ پھر بھی "ھل من مزید" ہی کے نعرے مارتے ہیں۔ اُنکے اقوال بھی نیک دل خطائیوں کے اظہار سے اتفاق رکھتے ہیں۔ اور ان کے تعجب خیز بیان کے صادق ہونے کی صاف الفاظ میں گواہی دیتے ہیں۔

**مُشک کی کرشمے**

اُس حافظِ حقیقی نے ہر جاندار اور ذی رُوح کو جسمی حفاظت کی اک نہ اک تدبیر سوجھا دی ہے۔ اور ایسے وسائل پیدا کئے ہیں جس سے وُہ بآسانی اپنے دشمنِ جانی پر فتحیابی حاصل کر لیتا ہے۔

ان ہرنوں کو اللہ جل شانہ نے سینگ عطا نہ کیئے تو ان کا نعم البدل مُشک سی مست

کر دینے والی شے سے بھرے ہوئے نافے دیدیئے یہ ہرن اپنے دشمن سے (خواہ شیر ہو یا بھیڑیا یا اور کوئی درندہ) ایسا بھاگتا ہے جیسا لاحول سے شیطان مگر پھر بھی جان جانے کا خوف اسے مشک کے بقچے چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے اُس کا دشمن "طور" والا سبق لیتا ہوا زمین پر آ رہتا ہے (یعنے بیہوش ہو جاتا ہے) اور بعض اوقات اس تازہ خوشبو کی نہ برداشت ہونے والی تکلیف (جو شدتِ حرارت اور یبوست سے عبارت ہے) دماغ شق کرتے ہی اُس کا کام تمام کر دیتی ہے۔ وہاں کی پہاڑیوں کا قول ہے کہ یہ ہرن اسی مشک کی بدولت غذا بھی حاصل کر لیتا ہے۔ سانپ کو (جسکے سوا کسی اور گوشت کا یہ خوگر نہیں) اپنی حکمتِ عملی سے بیہوش کرتے ہی سٹاچٹ کر جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی مشک کی بے حد خوشبو سانپ سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی ہے۔ اور دیوانہ یا مدہوش کرنے کے علاوہ حال کے پاس نہیں آنے دیتی ہے۔ جس سے وہ موذی کاٹنے اور اذیت دینے کے ارادوں میں ناکامیاب رہجاتا ہے غرضکہ یہ ہرن اپنے اوصاف اور خوبی میں یکتا ہے۔ سب جانوروں سے جدا اور سب ہرنوں سے عمدہ اور قابلِ قدر! نہ دیدہ نہ شنیدہ۔ کہ خدا جانتا ہے کیا بات پائی ہے۔

صاحبو! قدرت کے تماشے دیکھ دیکھ کر ہم لوگوں کی عقلیں فانوس کی مانند چکر کھانے لگتی ہیں۔ اُس کا پیارا اور مُردہ دلوں کو زندہ کر دینے والا ... نام زبان پر جاری ہو جاتا ہے ذرا غور اور تحقیق کا چشمہ لگا کر دیکھئے۔ کثرت میں وحدت کے نہ چھپنے والے جلوے نمایاں ہیں۔ تمام مصنوعات صانع کی قدامت اور یکتائی پر دال ہیں۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

ففی کلّ شیءٍ لہٗ آیۃٌ تدلّ علیٰ انّہٗ واحدٌ

**مشک کی قسمیں** ختا میں مشک تین قسم کی دستیاب ہوتی ہے۔ سب سے بہتر وہ ہے جو نافہ کے اندر پتھر کے طور پر سخت جمی ہوئی ہو اور اُس کی شناخت یہ ہے کہ اگر ایک کچے

سُوت کو لہسن کی گرہ میں ملکر مشک پر ذرا گھسئے تو لہسن کی بُو سُوت سے اُڑ جائیگی۔ دوسری قسم مشک کی وُہ ہی جو دانے دار ہوتی ہو اور ہندوستان میں ہر جگہ مِلسکتی ہے۔ تیسری قسم بالکل روغن کے طور پر گاڑھی ہوتی ہے نہ کھانے میں آتی ہے نہ دوا کے کام مگر پھر بھی اُسے جمع جماکر غیر ممالک میں یار لوگ بیچ ہی ڈالتے ہیں۔ پہلی قسم کو دیگر ممالک میں لیجانا اور رعیت کے معززین میں یا عام طور پر فروخت کرنا قانوناً سخت ممنوع ہے۔ بجز فغفور کے اور کوئی اُس دلِ خوش کن اور خداداد شئے کو اخذ کر نہیں سکتا۔ یا شاہزادگانِ خطا اس نعمتِ غیر مترقبہ کے مستحق مانے جاتے ہیں۔ اب رہیں دو قسمیں وُہ ہر ملک اور ہر دیار میں باقاعدہ جاسکتی ہیں کوئی ممانعت نہیں! اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں!

**ہرنوں کی گرفتاری کے وسائل** یہ ہوشیار اور اپنے گنوں کا پُورا وحشی جانور تین طور پر گرفتار ہو کر اپنے بے بہا جوہر سے مالامال کرتا ہے۔

(۱) جب شکاری کسی خاص مخبر کے ذریعہ سے یہ بات سُنتے ہیں کہ ہرنیں فلاں مقام سے گذرتی ہیں۔ فوراً اُسی مقام کے اطراف و جوانب میں اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔ اور اُنکے اشارے سے تین چار شخص بانسری بجانے والے (جو اسی غرض سے لائے جاتے ہیں) نہایت ملائمت سے میٹھی اور دردناک آوازیں نَے بجانے لگتے ہیں جسکے سُنتے ہی یہ لطیف طبع اور صدائے خوش پر مٹنے والے جانور مست ہو جاتے ہیں۔ اور عقل کی پابندی سے آزاد ہوتے ہی اُسی سمت (جدھر سے نَے کی آوازیں آتی ہیں) پلٹکر آہستہ آہستہ اٹھلاتے ناچتے چلے جاتے ہیں!

باوجود خوفِ گرفتاری اور جبلّی وحشت و رمیدگی یہ یہانتک قربت اختیار کر لیتے ہیں کہ تاک میں رہنے والے بے رحم شکاریوں کو بندوقوں سے مار لینا نہایت سہل ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض شکار کرنے والے لڑکوں کی مہین اور موہنی سُر کی آواز کی بدولت (جس پر

یہ بلا کے چلتے ہوئے ہرن ہوش کھو بیٹھتے ہیں، با آسانی جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ واقعی آواز خوش اور راگ ایک ایسے مقناطیسی مادّے کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ جو علاوہ انسانوں کے حیوانوں پر بھی پورا قبضہ کر لیتا ہے۔

**جانوروں پر آوازِ خوش کا اثر**

مجھے اس مقام پر ایک عجیب واقعہ یاد آگیا۔ اپریل ۱۸۹۸ء کے کوارٹرلی ریویو میں جانوروں پر باجہ کے اثر کی بابت ایک دلچسپ آرٹیکل شائع ہوا تھا پہلے پہل ایک چھپکلی پر آزمائش کی گئی۔ جوں ہی اس نے سرود کی پہلی آواز سنی اپنا سر اٹھایا اور چوکنی ہو کر سننے لگی۔ لیکن آہستہ آہستہ اپنے سر کو جنبش دیتی رہی۔ اس کے بعد سانپوں پر آزمائش کی گئی۔ ایک پنجرے میں کئی سانپ بند تھے۔ جب باجہ بجنا شروع ہوا تو انہوں نے اپنے سر اٹھائے۔ اور زبانیں نکالنے لگے۔ جب آواز میں کوئی خرابی اور کمی پیدا ہوتی تو ہر سانپ کا سر یکایک پیچھے کو ہٹتا نظر آیا۔ یوں تو ہر سانپ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن خونخوار "کوبرا" (جس پر ہندوستان کے سپیرے بڑی کامیابی سے فتح پاتے ہیں) ایک چھوٹی سی بانسری کی دلکش آواز سنتے ہی فوراً بیدار ہو گیا۔ جو اپنے پنجرے کے پیندے پر بڑے آرام سے بے خبر سو رہا تھا۔ پہلی آواز سنتے ہی اس نے سر اٹھایا۔ اور آنکھیں دروازے پر لگا دیں (کیونکہ اسی طرف سے آواز آرہی تھی) جب باجہ تیز ہوا وہ اپنی دم کے بل سیدھا کھڑا ہو گیا اور پھن پھولا دیا۔ اور باجہ کی لے پر ادھر ادھر جھومنے لگا۔ بالآخر جس قدر باجہ کی آواز میں تبدیلی ہوتی تھی اسی قدر سانپ کی ان غیر معمولی حرکتوں اور سر کی جنبش میں تبدیلی واقع ہوتی تھی۔

ممالک قطبی کا ریچھ بانسری اور باجہ کی آواز سننے کے لئے اپنی پچھلی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔ اور اپنا اطمینان ظاہر کرنے کی غرض سے کچھ بڑبڑاتا رہا۔ شیر کے پنجرے میں ہر شیر کا سر سرود کی پہلی آواز پر اٹھ گیا۔ جب باجہ میں تیزی ہوئی ہر شیر نے اپنی دم ایک طرف سے دوسری طرف ہلانی شروع کی جنکی وہ ہی کیفیت تھی جو کسی بلی کی جست کا ارادہ کرتے

وقت ہوا کرتی ہے۔ شیرنی باجہ سنتے ہی سنجہ کے پاس چلی آئی۔ گویا وہ شیر کو آگے سے ہٹانا اور خود نزدیک سے سننا چاہتی تھی۔ اسی طرح بھیڑیے اور ہاتھی پر آزمائش کی ٹھہرائی گئی۔ بانسری کی آواز پر ہاتھی دفعتًا کھڑا ہو گیا۔ اور غور سے سننے لگا اس کا ایک پاؤں زمین سے اٹھا ہوا تھا اور سارے بدن پر اک سکون کا عالم طاری تھا۔ جب تک بانسری بجتی رہی سکوت طاری رہی اور اگلی سی کیفیت! جب بانسری بند ہوئی سارا نقشہ بگڑ گیا ہاتھی باجہ اور بانسری بجانے والے کی طرف زور شور سے اپنے پانو پٹکنے لگا۔ چیتا نفیری کی تیز آواز پر غصہ میں کھڑا ہو گیا لیکن پھر سرود کی آواز سے حالت سرور میں اور خوشنود سا نظر آتا تھا۔ اس کے بعد بانسری بجنے لگی تو اُس کی سریلی آواز نے اس پر اور زیادہ اثر ڈالا۔

اِس قصّہ سے یہ حصّہ ملا کر سرود اور بانسری یا اور کوئی باجہ جس کو اشرف المخلوقات کہلانے والوں کے مذاق نے باجوں میں نہایت درجہ پسند کیا ہے۔ وحشیوں کو اور حیوانوں کو بھی مرغوب بالطبع ہے۔ اور انکی فطرت میں ایک نوع کی مانوسیت رکھدی گئی ہے۔ جسکی وجہ سے وُہ آوازِ خوش بطیبِ خاطر قبول کرتے ہیں۔ اور یہ قبولیتِ طبع ایک حد پہنچ کر انہیں آپے سے باہر کر دیتی ہے!!

آمدم برسرِ مطلب" مشک والے ہرنوں کی گرفتاری کے دو طریقے تو حوالہ قلم کر دیئے گئے اب تیسرا طریقہ لکھا جاتا ہے۔

(۳) جب یہ پہاڑوں کی بلند بلند چوٹیوں سے اوتر اوتر کر حالتِ تشنگی میں پانی کی بہتی ہوئی جھیل کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے موقع پر پیچھے اور آس پاس سے شکاری بہت سے آدمیوں کو لئے بڑے بڑے ڈھول اور نقارے بجاتے ہوئے دفعۃً گھیر لیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے بڑے بڑے جھانجوں کی وحشت خیز آوازوں سے وہ حشر مچانا شروع کرتے ہیں کہ بیچارے ہرنوں کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور وُہ ایسے بھاری

سنتے ہیں اور ایسے غل غپاڑے سے خائف ہو کر پانی میں کود کود پڑتے ہیں۔ پھر کیا ہے یہ شکاری باطمینان اُن ڈوبتے ہوؤنکو گرفتار کر لیتے ہیں۔

**مُشک کے دستیاب ہونیکا طریقہ** گو کہ اُن کی گرفتاری کے تینوں طریقے جاری اور مروج ہیں اور وقتاً فوقتاً انپر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ مگر سب سے عمدہ اور انسب بندوق سے شکار کرنیکا طریقہ ہے (جو ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں) جس سے وہ جانور آن کی آن میں مرجاتا ہے اور مشک بگڑنے نہیں پاتی۔ اور نہ پھیلنے! اگر کچھ دیر اُسے ایذا پہنچے اس حالت میں مشک (جو حقیقت میں اک قسم کا خون ہے) تمام وجود اور سارے جسم میں سرایت کرنے میں کچھ دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتی۔ اسی غرض سے شکاری دام میں پھانستے ہی اک باریک ریشمی دوڑے سے ناف کو جکڑ دیتے ہیں۔ اور اسقدر زور سے گرہ پر گرہ دیتے ہیں کہ رگوں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی سیدھی راہ سے آنے جانے والا مسافر خون کسی عاشق کی رُکتی ہوئی آہ کی طرح جہاں ہوتا ہے وہیں رُک جاتا ہے۔ اور رستہ مسدود ہونے کی بدولت اپنی دلی تمناؤں کا خون کرتا ہوا اور وطن مالوف کو خیرباد کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے مایوس اور نا اُمید ہو جاتا ہے۔

بسا اوقات بندش میں دیری واقع ہوتی ہے جس سے نہ صرف ناف ہی کی چرمی تھیلی میں نیلی مشک کی پختہ رنگ والی صورت نظر نہیں آتی بلکہ اُس کی (یعنے ہرن کی) رگ رگ سے بوئے مشک آنے کے علاوہ (جو نہایت تعجب خیز بات ہے) بوٹی بوٹی اور جسم کے گوشت کا ہر حصہ تلخ اور بیحد کڑوا کسیلا ہو جاتا ہے۔ الحاصل یہ مشک بھی عجیب ہے اور یہ جانور بھی غریب جانور ہے۔ عجیب عجیب کرشمے دکھاتا ہے۔ اپنی ہوشیاری کی حمایت سے شیر اور بھیڑیئے جیسے درندوں کے ہاتھ نہیں لگتا۔ علاوہ چستی اور چالاکی کے (جو اس میں ودیعت کی گئی ہے) بذاتہ اس قدر دور اندیش ہے کہ اپنی مینگنی تک کو بلّی کی طرح مٹی میں چھپا دیتا ہے۔ اور اپنے پیشاب کو اس لئے چاٹ جاتا ہے کہ دشمنوں کو خدا بھی پتہ اور

سُراغ نہ ملے۔ مگر افسوس بایں ہشیاری پھر بھی حضرتِ انسان کے زبردست ہتھکنڈوں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ ان چالیوں سے وُہ لاکھ اُڑتا ہے مگر آخر اُنکے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ انسان ضعیف ہونے پر بھی ایسی ایسی کارروائیں کرتے ہیں اور آسمان سے ستارے توڑ لاتے ہیں۔ خُدا جانے اگر قوی طور پر تخلیق ہوتی تو یہ اللہ کے بندے کیا کچھ کر چھوڑتے۔

بغفلت ساختِ دل تا وارہد از غیرتِ امکاں
چہا میسوخت ایں آئینہ اگر میداشت بینائی

**اصل غرض کیطرف مراجعت**

صاحبو! یہ بایں حیثیت غیر جنس (اور وُہ بھی قوی) پر کیونکر فتحیابی حاصل کرتے ہیں؟ اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یہ اللہ نے اپنی قدرت اور صنعت کے تماشے دکھائے ہیں۔ اور انسان ضعیف البنیان کو اشرف خلائق بنا کر عجیب قدرتیں (مگر حادثہ) عنایت فرمائیں۔ اور آدم کو تمام علوم و فنون کا مرکز بنا دیا۔ فیض کے چشمے جاری کر دئے۔ وہ ہمت و استقلال فیاضی سے بخشا کہ فرشتے دق و الق رہ گئے۔ ؎

دامن توفیقِ ما گردِ تعلق برنداشت آفتابِ ہمت ما از سرِ دُنیا گذاشت

یہی تو سبب ہی جو ہم اوپر لکھ آئے کہ حضرتِ انسان کی رسائی کے صدقے اور نثار یہ بازوئے جستجو اور قدم ہمت کی قوت سے موہوم سے موہوم اور زبردست سے زبردست شے تک پہنچکر اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔ اور قابو پاتے ہی زیر فرمان کر لیتے ہیں۔

بھلا ان ہرنوں کی بساط ہی کیا ہے۔ حضرت انسان تو ہوا کو باندھ لیتے ہیں۔ اور فانوس عقل کی روشنی سے ظلمات کی چھپی ہوئی چیزوں کا معائنہ کر لیتے ہیں۔ حکمتِ عملی کی لگاتار بارش اور صنعتوں کے ہل سے زمانے کی چکر کاٹنے والی زمین میں راحت رساں اشیا کے علاوہ عجیب اور مہذب اشیا کا ہرا بھرا کھیت کھڑا کر دیتے ہیں!

(غلام یٰسین آہ۔ دہلوی از کلکتہ)

# گناہ

(بہ تقلید حضرت آغا شاعر دہلوی)

اَے چہرہ پر جھرّیاں والے بوڑھے تیری رگوں میں خُون کا نام نہیں ہے۔ تیرے ارغوانی رخساروں پر بڑھاپے کا یاسمینی نُور برس رہا ہے۔ تیرے سیاہ اور گھنے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید ہو گئے ہیں۔ جنکو نہ کسی رنگریز کے قابلِ تعریف ہاتھوں نے رنگا ہے اور نہ انہیں کوئی خضاب ہمیشہ کے لئے سیاہ کر سکتا ہے۔ ان کی طبیعت اسی طرح بدل گئی ہے جس طرح تیری جوانی کا زمانہ گذر گیا۔ ہاں ذرا سچ کہنا۔ کبھی تجھے اپنا گذشتہ اور حسرت آمیز زمانہ یاد آیا۔ کیا تو نے اس گذرے ہُوئے پُر بہار وقت کو یاد کر کے کوئی ٹھنڈی سانس اپنے مُرجھائے ہُوئے دل سے کھینچی۔ کیا کبھی گذشتہ زمانہ کی یاد نے تیرے دِل کو میلا کیا۔ اور کیا تو نے عُمر کا ادنےٰ سے بھی ادنےٰ حصّہ زمانِ رفتہ کی تلاش میں بسر کیا۔ اگر تو نے ایسا نہیں کیا۔ تو مجھے تیری حالت پر افسوس آتا ہے۔ مگر تو قابلِ رحم ہے۔ آہ بوڑھا ہے۔ ضعیف ہے۔ معذور ہے۔ آ مَیں تیری مدد کرتا ہُوں اور تجھ کو تیرا گذشتہ زمانہ یاد دلاتا ہُوں۔

اَے سفید پلکوں والے بوڑھے وُہ دِن تجھے یاد ہے۔ جب تو اپنی خاک میں مِل جانیوالی ماں کی آغوش میں دُودھ پی رہا تھا۔ جب تو اپنے ننھے ننھے لال لال ہونٹوں سے کچھ اس انداز سے ہنسا کرتا تھا کہ تیری ماں کا دل اُس کے پہلو میں اسی طرح تڑپ جاتا تھا جس طرح تیرے دُودھ کے سفید سفید دانت تبسّم کے وقت بجلی گرایا کرتے تھے۔ جب تو اپنی روشن اور سیاہ مگر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی آنکھوں سے پہروں آسمان پر خوبصورت چاند کے مُکھڑے کو گھورا کرتا تھا۔ اور اپنی نازک کلائیوں کو حرکت دے دیکر چھوٹی چھوٹی انگلیوں

سے اشارے کیا کرتا تھا - اور خدا جانے تو نے چاند میں کونسی بات دیکھ پائی تھی کہ گھنٹوں اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتا تھا - تجھے اپنی وُہ گلکاریاں یاد ہیں جنہیں تو اپنی نرم اور نازک لبوں سے نکال کر ہوا کے تموج کے ذریعہ سے چاند کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کیا کرتا تھا - کیا تجھے اپنی وُہ بے سُود کوشش یاد ہے - جب تو چاند کو اپنی آغوش میں کھینچنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر تھکا دیا کرتا تھا - اور جب تجھے اپنی اُمید میں مایوسی ہوتی تھی - تو ہنستے ہوئے چہرہ سے بسُورنے لگتا تھا اور کچھ دیر بعد ہیں ہیں چیخیں جو چھوٹے سے گلے اور پیارے لبوں سے دلفریب معلوم ہوتی تھیں - سُنائی دینے لگتی تھیں - پھر تیری ماں آجاتی تھی - اور تجھے روتا دیکھ کر (اگرچہ تیری آنکھوں سے کوئی بھی دُرِ اشک نہیں گرتا تھا) چھاتی سے لگا لیتی تھی - اور تو اُسکا خون جسے دنیا والے دُودھ کہتے ہیں اور جو تجھے آبِ کوثر سے زیادہ میٹھا اور مزیدار معلوم ہوتا تھا غُرغُر کر کے پینے لگ جاتا تھا -

اگرچہ تو اسوقت فرشتہ سے زیادہ معصوم اور رُوح سے زیادہ پاک تھا - لیکن پھر آدم کا بیٹا تھا - آدم کا گناہ تیرے عنصری خمیر میں موجود تھا اور آج یہ پہلا دن تھا کہ تو نے گناہ کے دروازہ میں پہلا قدم رکھا - اور دُودھ پیتے پیتے شوخی سے یا یُوں کہو سادگی سے اپنی بیقصور اپنی بیگناہ اور اپنی بیخطا ماں کی چھاتی میں زور سے کاٹ کھایا - اور جب اُس نے بیچین ہو کر تجھے اپنی چھاتی سے علیحدہ کر دیا تو تو نے جلدی سے چہرہ بگاڑ کر رونی صُورت بنالی - ہرچند تجھے خُدا نے گویائی کی طاقت نہیں دی تھی - پھر بھی تو نے اُس دلسوز اور مہربان بلکہ شفیق ماں کو نگاہوں نگاہوں میں یہ دھمکا کر چھوڑا کہ اگر دُودھ نہیں پلاؤ گی تو ابھی غل مچاؤنگا - دیکھ لے ضعیف اور قبر میں پاؤں لٹکانے والے بوڑھے یہ تیری پہلی گستاخی تھی جو تو نے اپنی ماں سے کی - وُہ ممتا کی اندھی ماں تیرے اس قصُور کو خیال میں بھی نہیں لائی - وُہ اپنی تکلیف بھول گئی اور تیری پرورش میں

مشغول ہو گیا۔

اِس طرح چار سال تک ناز برداربان تیری خدمت کرتی رہی۔ اور پھر ایکدن تجھ کو تیرے باپ کے دامنِ عاطفت اور اپنے دمِ واپسیں کی دُعاؤں کے سپرد کر کے تیرے دیدار کی حسرت لئے دُنیا سے چل بسی۔ مہربان ماں کے فراق کا غم تجھے کیا ستاتا۔ کیونکہ تو ابھی تک عالمِ سرِ وشتستان کا ایک نُورانی پیکر تھا۔ تیرا رُوحانی ہیکل بسم اللہ کے گنبد میں دستبرد سے محفوظ تھا۔ تجھے ماں کی وفات اسوقت محسوس ہُوئی۔ جبکہ شام کے وقت گرسنگی کے ہمزاد نے تجھ سے اپنا روزینہ طلب کیا۔ اسوقت تجھے ماں یاد آئی اور شاید تو تلملا کر رونے ہی لگا تھا کہ باپ کا مہربان ہاتھ تیرے سر کو چھوتا ہوا دکھائی دیا اور اُس نے تجھے آغوش میں کھینچ لیا۔ دیکھ تیرا باپ کیسا فیاض تھا کہ اُس کی بے انتہا اور پے در پے آنیوالی مہربانیوں نے ماں کی یاد کے غم کو تیرے ننھے سے دِل میں پھٹکنے نہ دیا۔ اُس نے تجھے کبھی ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے نازنین جسم سے پھول کی چھڑی تک نہیں چھوائی۔ آہ اب تو ماں کو بالکل بھول گیا تھا۔ اُس کی یاد تجھے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی وہ تجھے بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھی۔ دیکھ اے بارِ گناہ سے خم کمر ہونے والے بوڑھے یہ تیرا وہ گناہ ہے جس کی تلافی کا خیال ابھی تک ستّر سال کے بعد بھی تجھ کو محسوس نہیں ہوا۔ تیری حسرت نصیب ماں کی روح اب تک اس اُمّید میں ہر رات تیرے سرہانے آ کر کھڑی ہوتی ہے کہ کبھی تو خواب میں بھی اپنی گم گشتہ بد نصیب ماں کا خیال کرے۔ جس سے اسکو آسمانی مسرّت حاصل ہو۔ مگر نہیں وہ ہر صبح تیرے پاس سے مایوس جاتی ہوئی نظر آتی رہی ہے۔

اے مجسم عبرت بوڑھے۔ پھر تو مکتب میں بستہ لئے جاتا دکھائی دیا۔ معلّم تجھے سبق پڑھا کر ہدایت کر دیا کرتا تھا کہ یاد کرے مگر تو سبق یاد کرنے کے بجائے جورِ اُستاد سے جو مہرِ پدر سے بدرجہا افضل ہے تنگ آ کر اُس کی موت کی دُعائیں خدا کی جناب میں مانگا کرتا تھا۔

حضرتِ حق میں اٹھا کر ہاتھ ہر صبح و مسا چپکے چپکے مانگتا مرگِ معلّم کی دعا۔

اگرچہ تیری یہ دعا قیامت تک قبول نہیں ہوئی کیونکہ جب ایک معلّم مرگیا تو دوسرا جو بیرحمی کے فن میں پہلے سے زیادہ مشاق ہوتا تھا۔ تیری دعاؤں کو بے اثر ثابت کرنے کے واسطے ایک سبز عصا ہاتھ میں لئے مکتب میں تیرا منتظر ہوتا تھا۔ اس طرح تونے اگرچہ کبھی بدخو اُستادوں کے خون اپنی معصوم دعاؤں کی گردن پر لئے۔ لیکن جب باپ نے تیری ان بیجا شکایتوں سے کہ جو ہر روز اُستاد کے حق میں کی جاتی تھیں۔ کوئی دادرسی اور تجھے اپنی رہائی دشوار نظر آئی تو تُونے مکتب سے بھاگنا شروع کر دیا اور اب کئی کئی روز تک گھر میں اور مکتب میں تیری صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ماں کی فریفتہ رُوح خدا جانے کن کن سنسان جنگلوں میں تیری خاطر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مگر تجھے کچھ خیال نہیں تھا۔ ضعیف باپ کے تھک جانے والے پاؤں سینکڑوں گز زمین جنگل بھر میں اُلٹ ڈالا کرتے تھے لیکن تیرا پتہ نہیں لگتا تھا۔ تجھے بھوکا مرنا قبول سنسان جنگل قبول اور اس کی دہشتناک کالی کالی راتیں قبول۔ لیکن باپ کا پیار اور اُستاد کی مار منظور نہیں تھی۔ تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ کبھی گھنے جنگلوں میں گھس گیا ہے۔ اور کبھی پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپا ہے۔ اگرچہ تو دلسوز باپ کو ہر وقت ناخوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر وُہ رہشت نصیب جس کی موت پر اسوقت برسوں کے متعدد عشرے گذر چکے ہیں۔ تیری صورت دیکھتے ہی تیری لغزشوں سے درگذر کر دیا تھا اور تیری خطاکاری کے باوجود تجھے یہی کہنے لگتا کہ تو ابھی بہشتی گلاب کی کلی ہے۔ تو باغِ حیات کا نورسیدہ شگوفہ ہے جسکو معصیت کی گرد نے ناپاک نہیں کیا تو خدا کی رحمت ہے جو گناہ کے دھبّہ سے بالکل پاک ہے اور تو پاک فرشتہ ہے۔ اور تیرے کان برائیوں کی آواز سے ناآشنا ہیں۔

اے خدا کے گنہگار بندے! تو اُس شام کو یاد کر۔ جبکہ مہربان باپ کی دعا کی آواز

تجھے یوں کہتی ہوئی سنائی دی۔ اے ماں کے لختِ جگر۔ اے باپ کے نورِ بصر اور اے مرنے والی کے آخری یادگار۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ تیرا دل اسی طرح ہمیشہ غموں سے دور اور خوشیوں سے معمور رہیگا۔ کیا تیرا باپ سدا کے لئے تیری پرورش کا کفیل رہیگا۔ زندہ رہیگا۔ کیا موت کا زبردست ہاتھ بہت جلد اس کے سایہ کو تیرے سر سے نہیں اٹھا لیگا۔ اے نادان اور بھولے لڑکے تو اسوقت کو بہت قریب آیا جان جو تیرے خیر طلب باپ کو مرنے والی ماں کی طرح ہمیشہ کے واسطے تجھ سے جدا کر دیگا۔ اے مردہ ماں کی غمناک نشانی اور زندہ باپ سے عنقریب بچھڑ جانے والے بچے۔ وہ سال بڑی تیزی سے آرہا ہے جس کی فصلِ خزاں میں تو بے باپ کا کہلا دیگا اور جس کے آفتاب کی روشنی میں تو یتیم بنا دیا جائیگا۔ اے میرے قابلِ رحم بیٹے۔ تو دنیا کے میدان میں اکیلا رہ جائیگا۔ تیرے ہمدرد اور غمخوار دنیا سے اٹھ چکے ہونگے اور تو تنہا زمانہ میں اپنی حالت پر آنسو بہانے کے لئے چھوڑ دیا جائیگا۔ کوئی رحم کا ہاتھ تیرے رخسار کی بہتی بڑھانے والے اشکوں کو پاک کرنے کے لئے موجود نہیں ہوگا۔ اور کوئی ہمدرد آواز تسلی آمیز جملے تیرے حق میں استعمال کرتے ہوئے نہیں سنائی دیگی۔ ہاں تو دنیا میں تنہا ہوگا اور تیرے پیار کرنے والے مر چکے ہونگے۔ تیری حالت پر آنسو بہانے والے خاک میں دفن ہونگے۔ اے دنیا کے چھوٹے مسافر۔ کوشش کر کہ تو اس وقت کسی کا محتاج نہ ہو۔ اے خام عقل طفل ہمت کر کہ تن تنہا اسوقت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنیکے قابل ہو جاوے۔ اے بے سمجھ لڑکے۔ ذرا غیرت کو کام میں لا کہ تو اپنے محبت کرنے والے اسلاف کی بشرمناک یادگار نہ بنے۔

اے جھرجھری آواز والے بوڑھے۔ یہ نصیحت تھی جو تیرے باپ نے اپنی موت کے سال سے کئی برس پیشتر کی تھی۔ لیکن تجھ جیسے سنگدل پر ان جگر خراش الفاظ نے کوئی اثر نہیں کیا۔ تو نے ان سچی باتوں کو باپ کے بڑھاپے کا خبط خیال کیا اور ان کی

صداقت پر اصلا اعتنا نہیں کی۔ اوہ یہ کیسا ناقابلِ معافی اور سخت گناہ تھا کہ قابلِ پرستش باپ کی نافرمانی میں تو ہمیشہ ثابت قدم نظر آیا۔ اوہ تو کیسا بدنصیب تھا کہ باپ تجھ سے کبھی راضی نہیں ہوا۔ اوہ تو کیسا دیوانہ تھا کہ اس کا بوڑھا دل دکھانے میں ہمیشہ مستقل رہا۔

اسوقت تو اپنی عمر کا دوسرا عشرہ طے کر رہا تھا اور تیری سالگرہ کا چودھواں سال تھا کہ تیرے باپ کی پیشینگوئی پورا ہونے کا وقت آگیا۔ یہ وہ ناگزیر وقت تھا کہ فانی انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ اور ناخوش گوار حصہ ہے۔ یہ وہی وقت تھا جس سے تیرا باپ تجھے بارہا خبردار کر چکا تھا۔ آخر اُس کی موت کے دِن کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور پلک مارنے میں اتنا بلند ہوگیا کہ اُس کی روشنی کے ذریعے چھت کے روزن میں سے چھن چھن کر چھت کے سایہ میں سونے والے بوڑھے باپ کے مُردنی چھائے ہوئے چہرہ پر گر رہے تھے۔ اور اس کے تغیر و تبدل کو صاف دکھا رہے تھے تو اس روشنی میں اس ناگزیر اور ضرور ہونے والے سانحہ کو دیکھ لیتا۔ تو اپنی روحانی آنکھوں سے موت کے فرشتہ کو دروازہ میں گھستا ہوا دیکھ سکتا تھا اور تو اس کے یکایک آجانے کی سرسراہٹ کو تاڑ جاتا۔ اور تیرے باپ کے اعضاء کا تشنج اور چہرہ کی سفیدی اسکی گواہی دیتی مگر تو اس عالم میں نہیں تھا۔ ایسی دور تو پہنچا ہوا تھا جہاں تجھے خود اپنی خبر نہیں تھی۔

آخر وہ دن ختم ہوا۔ رات آئی اور اُسکا بھی زیادہ حصہ گذر گیا۔ اب پانچ بج چکے تھے۔ اس سنسان اور خاموش کمرہ میں جہاں تیرا باپ دم توڑ رہا تھا۔ ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور تیرے باپ کے ناگزیر وقت میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کہ اس کی بوڑھی زبان پر زور سے تیرا نام آیا۔ اور تو فوراً ہی گھبرا کر اس کے پاس گیا۔ اور اس کو ایسی حالت میں دیکھا جو تیری نگاہوں میں بالکل اجنبی تھی اور جسے دنیا والے ترغ کے نام سے پکارتے

ہیں۔ اس وقت اُس کی نبض بہت سُست چل رہی تھی۔ اُس کا دِل زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے جسم میں خُون نہیں رہا تھا۔ اُس کے اعضا میں برف کی سی خنکی سرائت کرتی چلی گئی۔ آخر اُس نے اپنے اکھڑی سانس کو سنبھال کر اور سینہ پر ہاتھ مار کر کہا

"اَے میرے بچے۔ مَیں وہاں جاتا ہُوں۔ جہاں سے کوئی نہیں پھرا۔ مجھے وُہ سفر درپیش ہے جہاں سے واپس آنا معلوم"۔

"اَے لڑکے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ مَیں نہیں جانتا۔ دُنیا تجھ سے کس طرح سلوک کریگی۔ اور مجھے خبر نہیں۔ کہ زمانہ تیرے موافق رہیگا یا مخالف اَے بدنصیب فرزند۔ میں نے ہر چند چاہا کہ تو کسی لایق ہو جائے۔ اور وہ زندگی بسر نکرے۔ جس پر غیرت موت کو ترجیح دے۔ مگر میری زندگی میں یہ اُمید بر نہ آئی۔ جو شُدنی تھا وُہی ہوا۔ اور وُہی ہوگا۔ اے بیٹے۔ اب تیرا باپ مرتا ہے اور تجھے ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہے۔ اب تو قیامت تک اس کی صُورت نہیں دیکھ سکیگا۔ مگر اس دم توڑنے والے باپ کی تجھ سے التجا ہے۔ کہ تو دُنیا میں خواہ کیسی مبتذل اور ذلیل حالت میں کیوں نہ رہے۔ مگر نیکی اور ایمان کو ہاتھ سے نہ دینا۔ ہاں ذرا اُن مرنے والوں اور پیار کرنے والوں کی شرم رکھ لینا۔ جن کو آسمانی تقدیر نے زبردستی تجھ سے جُدا کر دیا ہے۔ اَے ناشاد باپ کے نامراد بیٹے۔ آہ تو تنہا ہے اور تجھے دُنیا میں تنہا زندگی بسر کرنا ہوگی۔ مگر تو اس تنہائی سے اپنے دِل کو میلا مت کرنا تیری ماں کی غمگین رُوح تیرے لئے بےچین ہوگی۔ تیرے باپ کی سوگوار رُوح تیری مصیبت میں شریک ہوگی۔ تیرا دُنیا میں کوئی مددگار نہیں۔ اس رنج سے کبھی تو غمگین مت ہونا ہم مرنے والوں کی دم نزع کی دُعائیں زندگی میں تیری مددگار ہونگی۔ اور مَیں خُدا سے دُعا کرتا ہُوں کہ تو دُنیا میں سدا خوش حال رہے اور نیک راستہ پر چلے۔ اَے خُدا تو جو آسمان پر ہے۔ مَیں اس انجان اور بھولی روح کو

تیرے رحم کے سپرد کرتا ہوں تو اس کا سب سے زبردست نگہبان ہے اور بیشک تجھ کو اپنے پیدا کئے کی لاج ہے۔

اِس جملہ کے ختم کرتے کرتے تیرے باپ نے چند ہچکیاں لیں اور اس کی آواز پھر تجھے نہیں سُنائی دی۔ اِس عرصہ میں قابض ارواح۔ نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کرتا رہا۔ اتنے میں گھر کے گھنٹہ نے چھ بجا دیئے اور چراغ جھلملا جھلملا کر خاموش ہوگیا اور ادھر تیرے باپ کا ستارۂ حیات اندھیرے کے گہرے دلدل میں غائب ہوگیا تو یہ تمام تماشا خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر پیکرِ تصویر بنگیا۔ گویا تو ایک سنگ مرمر تھا جسکو سنگتراش نے انسانی جامہ میں گھڑا کر دیا تھا۔ اسوقت تجھ میں اور اُس بوڈھی لاش میں جو تیرے سامنے پڑی تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا کچھ دیر کے بعد تو ہوش میں آیا۔ تیرے حواس نے اس واقعہ کو معلوم کیا اور تیری عُمر میں یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ تو بے انتہا مضطرب اور غمگین ہوا۔ تو نے زور سے ایک چیخ ماری اور باپ کی لاش سے لپٹ گیا۔ وُہ سنسان مکان جسکی چار دیواری میں تیرے باپ نے جان دی تھی۔ اب تیری متواتر چیخوں سے گونج رہا تھا۔ تیری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور تو اُس بیجان لاش سے کہہ رہا تھا۔ اَے باپ اے پیارے باپ۔ اے مہربان باپ۔ تو مجھ سے کیوں خفا ہوگیا۔ اے باپ تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اے باپ۔ ہاں ایک دفعہ وُہ مبارک آواز میرے سوگوار کانوں کو پھر سُنا دے۔ اے باپ ایک بار شفقت کا ہاتھ میرے سر پر اور پھیر۔

تو نے اپنے باپ کا ماتم کیا اور پھر اسے اندھیری قبر میں چھوڑ آیا۔ جسپر پتھر کی وزنی سلیں لگادی گئیں۔ اور منوں مٹی ڈالدی گئی۔ تو نے اس کے ماتم کے لباس کو بہت ہی کم دن اپنے بدن پر رکھا۔ اور اس کو بھول جانے کے لئے عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا۔ وُہ تنکا جو شہتیر بنکر تیری آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اب نکل چکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں تو نے بال و پر نکالے۔ اور اُس راستہ چلنے لگا۔ جہاں گناہ کے

بیشمار بھوت دلچسپی کا لباس پہنے کھڑے تھے - تو اُنکی ظاہری آراستگی پر فریفتہ ہو گیا - حُسن ایک حسین پری کی صُورت میں تیرے سامنے نمودار ہوا اور تو نے آنکھیں بند کر کے اُسے اپنا دل دیدیا - افسوس تو اس دام میں ایسا پھنس گیا - جس سے اب تک حالانکہ چراغ سحری ہو رہا ہے - تجھے رہائی نصیب نہیں ہوئی - عشق کے شیطان نے تجھ سے آنکھیں لڑائیں اور تو نے اپنی زندگی اُس کے ہاتھ بیچ دی - جہاں کوئی حسین صُورت دیکھی - تیرے منہہ میں پانی بھر آیا - جہاں کوئی اچھی شکل نظر آئی - تو مچل گیا - تیرا دلسوز باپ جواب جنت میں رہتا ہے - تیرے لئے اتنا اندوختہ چھوڑ مرا تھا کہ تلاشِ معاش کی فکر نے ایک منٹ بھی تیرے عیش طلب دل میں خلجان پیدا نہیں کیا - افسوس تو اُسکی اُس وصیت کو جو نزع کے وقت کی تھی بھول چکا تھا - اگر دنیا میں کوئی غم تجھے ستا سکتا تھا تو وہ غمِ معشوق تھا - اگر تیرا کوئی دشمن تھا تو وہ رقیبِ روسیہ تھا اور اگر کوئی ستم تجھ پر بلائیں توڑتا تھا تو وہ فراقِ یار تھا - زمانِ فراق میں تجھے اکثر موت آجایا کرتی تھی - لیکن پھر جی اُٹھتا تھا - ادھر فراقِ یار (خدا نکرے اب نصیب ہو) برسات کی گھٹاؤں کی طرح تیرے سر پر چھا گیا اور ادھر تو نے قبر کا کونا بسایا - یہ شمار کرنا مشکل ہے کہ تو کے دفعہ مرا اور کے دفعہ زندہ ہوا - مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں مرتبہ ملکِ عدم کی سیر کی - سینکڑوں بار صحرائے فنا کو چھان مارا - گویا موت ایک جامہ تھا - جسکو جب چاہا اُتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا اور جب جی چاہا پہن لیا - یا وہ ایک فانوس تھا کہ جب ضرورت ہوئی روشن کر لیا اور جب دل میں آیا گل کر دیا -

اے ناموس برباد کنِ اسلاف تو نے اس ہوس بازی میں وہ کمال پیدا کیا کہ قیس و فرہاد کا فسانہ تیرے نزدیک بچوں کا کھیل تھا - آبادی چھوڑی - ویرانہ پسند کیا اور سر پر مشتِ غبار ڈال کر گریبان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے - کبھی اس جنگل کی خاک چھانی اور کبھی اس بیابان میں اپنی آبلہ پائی کو خارِ مغیلاں سے روشناس کیا - آج اس صحرا کے

گلِ خودرَو کی بہاریں لوٹیں اور کل اس مرغزار میں غزالانِ ناکردہ رام سے رشتۂ موانست قائم کیا۔ کبھی جنگلوں میں تنکے چُنتے نظر آتا تھا اور کبھی کسی گلزار میں ایک سُوکھی شاخ پر آشیانہ بنا رہا تھا۔ کبھی تو دامِ صیاد میں پھڑک رہا تھا اور کبھی کنجِ قفس میں اپنے ہمصفیروں کو یاد کر کے اُنکی آزادی پر رشک کر رہا تھا۔ کبھی فصلِ خزاں میں بہار کے موسم کی یاد میں دیوارِ چمن پر نوحہ خوانی کرتا نظر آتا تھا۔ مَیں حیران کہ تو کون تھا اور تیرے خیالات کیا تھے۔ تجھے خدا نے جامۂ انسانیت عطا کر کے اشرف المخلوقات کا قابلِ فخر خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن تو ایک مشت پرند کی زندگی پسند کرتا تھا۔ فراق کی تاریک راتیں جب بڑی نیند کی خوگر فتہ آنکھوں کو خواب سے باز رکھتی تھیں تو تو اسکا بدلہ اپنے ہمسایوں سے لیا کرتا تھا اور نالۂ نیم شبی سے محلہ بھر سر پر اُٹھا لیا کرتا تھا۔ آسمان تیرے نزدیک ایک نیلوفری سائبان تھا جو آہِ سحری کے گولہ بارود کے آگے ایک لحظہ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کبھی تو دُعا سے لڑتا تھا اور کبھی اثر سے جھگڑتا تھا۔ دُنیا تجھ سے تنگ تھی اور تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اور دِل یار کے گیسوئے پُرشکن میں اسیر تھا اور وہ بادِ صبا کے ظلم سے مجموعۂ پریشانی بنا ہوا تھا۔ مگر اس مظلوم گروہ کی داد رسی نوشیرواں جیسے عادل نے بھی نہیں کی۔ تیرا دل بھی خدا جانے کیا عجوبہ تھا کہ کبھی وُہ شیشہ بنجاتا تھا اور کبھی آئینہ۔ کبھی وُہ قطرۂ خُون کی صورت میں جلوہ گر ہوتا تھا اور کبھی اسیرِ فرنگ بنکر زلفِ بتاں کا سلسلہ جُنبان تھا۔ کبھی خیالِ یار کا جولانگاہ تھا اور کبھی وُہ ایسی شئے بنجایا کرتا تھا کہ تو اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یار لوگوں کی نذر کیا کرتا تھا۔ تو وُہ بیمار تھا جسکے علاج سے طبیبوں نے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔ عیسیٰ آسمان سے اُتر آئے مگر انہیں بھی تیری شفا کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ الغرض تو نے یہ تمام مراتب طے کئے اور جب ان منزلوں سے گذر گیا تو پاک شہیدوں کے ٹولے میں داخل ہو گیا۔ پھر وُہ کونسے ناکردنی کام تھے جو تو نے نہیں کئے۔ محلہ والوں کے لئے تو ایک مہیب

دیو تھا کہ صورت دیکھتے ہی دم فنا ہو جاتا تھا۔ ایک خبیث رُوح تیرے جسم میں حلول کر آئی تھی جس کا زہریلا اثر تمام بدن کی رگوں میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دوڑ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

(محمود خاں شیرانی۔ ٹونکی)

---

# دُھوپ اور چاندنی

روزِ روشن میں مجھے کل ماہتاب آیا نظر — دُھوپ کی تیزی تھی اور ڈھلنے لگی تھی دوپہر
یوں فلک پر ماند اور پھیکا نظر آتا تھا چاند — طفلِ مکتب کا پتنگ اُڑتا ہو جیسی اوج پر
روزِ روشن میں پڑھی کل میں نے اک شاعر کی نظم — اُس کو نثری سی بھی پایا میں نے بڑھ کر منتشر
لیکن آخر جذبۂ دل کے تلاطم کی طرح — چشمۂ خورشید کی موجیں گئیں یکسر گذر
اور شب نے آکے شہر و دادیٔ و کہسار کو — چھا لیا اپنی خموشی اور حیا سے سر بسر
چاند نکلا اوڑھ کر اس وقت چادر ناز کی — حُورِ عیں آکر ہوئی جنت سے گویا جلوہ گر
وادیٔ شب پر بہایا اُس نے دریائے نور کا — نقرئی ابر اُس نے برسایا زمیں پر یا مگر
اب جو پھر اس چاندنی میں نظم وہ میں نے پڑھی — وجد طاری ہو گیا مجھ پر ہوا ایسا اثر

منکشف مجھ پر کیے بنکر مفسّرات نے
وُہ دقائق اور معارف تھے جو اس میں مستتر

ظفر علیخاں

# جلسۂ احباب

تیسرے پہر کا آغاز تھا۔ فرصت کا وقت پاکر میں اکیلا کمرے میں بیٹھا اِدھر اُدھر خیال دوڑا رہا تھا کہ دفعتہً دروازے پر دستک ہوئی اور ایک صاحب کواڑ کھول کر یہ کہتے در آئے :-

ناظم (اُنکا نام ہے) :- السّلام علیکم۔ حضت معاف کیجئیگا۔ جہانتک مجھے معلوم ہے آپ کا خالی وقت عموماً یہی ہوتا ہے۔

میں (اُٹھکر) علیکم السّلام۔ آپ کی خیرخواہی کا ممنون ہوں۔ میرا یہ وقت جیسا آپ نے فرمایا واقعی خالی ہے۔ جناب تشریف لائیے۔ سر آنکھوں پر آئیے۔ (سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آرام فرمائیے۔

وہ صاحب بیٹھ گئے۔ مزاج پرسی کے بعد اِدھر اُدھر کی چند باتیں ہوئی تھیں کہ میں نے کہا حضت کچھ نقلیں بیان فرمائیے۔ جی بہلیگا اور فائدہ بھی ہوگا۔

ناظم۔ بہت خوب۔ (ذرا سوچ کر اور عاشقوں کی بیتابانہ ہیئت بناکر ایک طرف کو خطاب کرکے آسمان کی طرف میں) ؎

اپنی بلا سے ہو کہ کوئی خوب رُو نہ ہو  سب کچھ مجھے بُرا ہے اگر پاس تو نہ ہو

میں :- سُبحان اللہ خوب ادا کیا آپ نے۔

ناظم :- اور لیجئے (فلسفیوں کی سنجیدہ صورت بناکر مجھ سے خطاب کرکے کانوں کی طرف میں) ؎

مانا کہ جی میں اپنے بُری خواہشیں نہ ہوں  وُہ خاک جی ہی جس میں کوئی آرزو نہ ہو

میں :- واہ خوب فرمایا۔ پُورا نقشہ کھینچدیا۔

ناظم :- اور لیجیے (بیوقوف شرابیوں کی حالت بنا کر مجھ سے خطاب کر کے اور ایک طرف اشارہ کر کے دھناسری کی دھن میں) ؎

فصلِ بہار و ماہِ تمام و بتِ نگار
سامان سب عیش کو ہوں یہ جام و سبو نہ ہو

میں :- واہ وا خوب ہی فرمایا۔ کمال کرتے ہیں آپ۔

ناظم :- اور لیجیے (فلسفیوں کی سنجیدہ صورت بنا کر مجھ سے خطاب کر کے مالکوس کی دھن میں) ؎

صورت جبھی بھلی ہے کہ سیرت بھی ساتھ ہو
باطن کسی کا گر ہو بُرا خوب رُو نہ ہو

میں :- کیا خوب غضب کر دیا۔

ناظم :- اور لیجیے (عیش پسندوں کی صورت بنا کر اوپر کی طرف دیکھ کر جیجاوتی کی دھن میں) ؎

یہ چاندنی ہو اور وہ آئینہ رُو نہ ہو
پھولوں کی یہ مہک ہو یہ وہ بھینی بُو نہ ہو

میں :- جزاک اللہ کیا فن ہے۔

ناظم :- اور لیجیے (عاشقوں کی صورت بنا کر ایک طرف کو خطاب کر کے دیس کی دھن میں) ؎

یہ حُسن قہر منظر و محبّر بھلا بھی
اچھا نہیں ہے فیض کی گر تجھ میں خو نہ ہو

میں :- ستم کر دیا ظالم۔

ناظم :- اور لیجیے (مسخروں کی ہیئت بنا کر ایک طرف کو اشارہ کر کے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے تحت اللفظ)

ان کی مسخرگی میں مجھے عذر کچھ نہیں
اتنا تو دیکھ لو کہ کوئی جانگلو نہ ہو

میں :- بھئی واہ لوٹا دیا۔

ناظم :- اور لیجیے (شُہدوں کی ہیئت بنا کر مجھ سے خطاب کرتے زلہ کی چلتی لے میں

کچھ آبرو سے ملِ نہیں جاتا جہان میں — پاپوش سے ہماری نہیں آبرو نہ ہو

مَیں :- خُوب !

ناظم :- اور لیجیے (سنجیدہ معقول صُورت بنا کر مجھ سے خطاب کر کے تحت اللفظ) ہے

معقول خوردہ گیری ہے مقصودِ ہی صلاح — کیا لطفِ اعتراض اگر مُو بمُو نہ ہو

مَیں :- واہ صاحب واہ -

ناظم :- (عیش پسندوں کی صُورت بنا کر تعجب سی تحت اللفظ) ہے

صحبت ہو ایسی خوش تو کوئی شعلہ رُو نہو — اور شعلہ رُو بھی ہو تو کوئی خوش گلو نہ ہو

مَیں :- ارے ظالم !

ناظم :- اور لیجیے (عاشقوں کی ناصحانہ ہیئت بنا کر ایک طرف کو ملتفت ہو کر تحت اللفظ)

انجمن اگر بڑی ہے نمائش کو کم کرو — حُسن اور اُس کا شہرہ بھلا چار سو نہ ہو

مَیں :- آہا - کیا معقول - جادو کرتے ہو -

ناظم :- اور لیجیے (دیوانوں کی حالت بنا کر کے ٹوڑی کی دُھن میں) ہے

دیوانگی میں نام و نشاں کیا ضرور ہے — عاشق ہی ہم نہیں ہے اگر آبرو نہ ہو

مَیں :- بہت خوب -

ناظم :- ایک اور لیجیے (عاشقوں کی صُورت بنا کر طنز سے ایکطرف اشارہ کر کی تحت اللفظ) ہے

لو صاحب آئے وعدہ وفا کرنے والے آئے — ہو شرم پاس بھی تو کبھی رُو برو نہ ہو

مَیں :- واہ واہ سبحان اللہ - کمال کرتے ہیں -

ناظم :- اچھا جناب اب اجازت چاہتا ہوں - دیر ہو گئی -

مَیں :- آپ نے ممنون کیا - جی تو نہیں چاہتا لیکن خیر -

ناظم :- (چلتے ہوئے) خدا حافظ -

مَیں :- فی امان اللہ +

(نذیر حسین احمد)

# شاہ محمد عبدالعلیم آسی

ہمارے کرم فرما مولوی محمد عبدالصمد صاحب عزیزی مجسٹریٹ و رئیس غازی پور مولانا آسی کے کلام کے نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی غزلیں ہمیں بھیجتے ہیں اور چند سطور میں مولانا موصوف کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

جنابِ من! میں ایسے زمانۂ قحط الرجال میں آپ سے ایک ایسے بزرگ اور استاد کامل الفن سے معرفی کراتا ہوں جنکی ذات بابرکات اس زمانہ میں مغتنمات سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جنکی بہت زیادہ عظمت اب کی مرتبہ دہلی کی حالت دیکھ کر معلوم ہوئی۔ نام نامی انکا حضرت مولانا مولوی شاہ محمد عبدالعلیم صاحب ہے۔ اور شعروں میں تخلص اپنا آسی فرماتے ہیں۔ مولد انکا قصبہ سکندرپور ضلع بلیا ہے جو ایک مشہور اور تاریخی مقام مردم خیز ہے۔ اور قیام انکا ہمارے شہر غازی پور میں رہتا ہے۔

آپ کے صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کا محصور کرنا ہمارے امکان سے باہر اور ہماری تحریر کے احاطہ سے خارج ہے۔ آپ ایک مستند عالم باعمل متبع شریعتِ محمدی ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ ایک صوفی صافی طینت محی طریقتِ احمدی ہیں۔ ہزارہا طالبین نے آپ سے اکتسابِ کمال کیا ہے اور فیضیاب ہوئے ہیں۔ آپ ان سب کمالات کے ساتھ فنِ ادب میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ عربی اور فارسی زبان پر بھی وہی قدرت رکھتے ہیں جو آپ کو اردو اپنی مادری زبان پر حاصل ہے۔ اسوقت سن شریف انکا قریب ستر برس کے ہوگا۔ سبحان اللہ صورت شکل کیسی متبرک و مقدس کہ صحابہ کرام کی یاد دلانے والی۔ اور اخلاق کیسے پاکیزہ کہ سچے اسلام کا یقین دلانیوالے۔ انسان اگر تھوڑی دیر بھی انکی صحبت میں بیٹھے تو دل میں گداز اور قلب میں ایک خاص سرور پیدا ہو جائے۔ اعلیٰ درجہ کے مستغنی المزاج۔ پورے طور کے پابندِ اوقات۔ الغرض ہر طرح پر خیر مجسم اور اکابرین سلف کی یادگار ہیں۔ آپ کو زمانہ تحصیلِ علوم سے ایک قسم کا ذوق شعر و سخن سے بھی رہا اور آپ کو تلمذ اس فن میں خاندان جناب شیخ امام بخش صاحب ناسخ لکھنوی سے ہے۔ آپ نے بھی ان قیود کو جو نسبت ترکیب الفاظ کے جناب میر علی اوسط صاحب رشک ارشدِ تلامذۂ ناسخ مرحوم نے لازم رکھا تھا پسند فرمایا۔ ایک زمانہ میں ہمارے حضرت مولانا کے کلام کا رنگ

بالکل عالمانہ اور مشکل پسندی لئے ہوئے تھا۔ لیکن جب سے آپ کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی اور عشقِ حقیقی نے اپنا جلوہ دکھایا۔ پہلا رنگ باقی نہ رہا۔ آپ کے کلام میں وہ مذاق پیدا ہو گیا جسکا لفظوں میں بیان کرنا محال ہے۔ آپ کی فصاحت اور آپ کی بلاغت اور آپ کا قادر الکلام ہونا بڑے بڑے فصیح و بلیغ اہل زبانوں نے مان لیا ہے۔ آپ ہر صنفِ کلام پر پورے قادر ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ نہ تو آپ اپنے کلام کو مجتمع کرتے ہیں نہ چھپنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مجھے اس وقت چند غزلوں کے اشعار جو یاد ہیں پیشکش کرتا ہوں:-

بڑھ کے شہ رگ سے گلے ملنے کو وہ آمادہ تھا　　ہائے رے وہم غلط اب تک میں دور افتادہ تھا
توڑنا مینائے مے کا دل شکن کیونکر نہ ہو　　محتسب کو کیا ہوا تھا میں تو مستِ بادہ تھا
دل کہاں تھا جذبِ دل پر میں جو کرتا اعتماد　　میں تو اک دل سوختہ دل باختہ دلدادہ تھا
زاہد و واعظ جو آتے سب تکلف برطرف　　خوب فرشِ بوریائے نقشِ موجِ بادہ تھا
حالِ دل کیا اُس سے کہتا دل ہی تھا جسکا ہو گھر　　گو نہ سودائی ہو عاشق پھر بھی کتنا سادہ تھا

---

عرش ہے دل میں نہ مسجد ہے نہ کعبا دل میں　　قلب بھی یار مگر گھر ہے تمہارا دل میں
کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَان کی نیرنگی ہے　　دیکھ تو کیا نظر آتا ہے تماشا دل میں
ہر جگہ خالِ رخِ یار نے بدلا اک بھیس　　تل بنا آنکھوں میں عاشق کی سویدا دل میں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کھوئے ہوؤں کو ہم　　ہم نے جب ان سے سنا گھر ہے تمہارا دل میں
کارِ امروز بفردا مگذار اے آسی　　آج ہی چاہیے اندیشۂ فردا دل میں

---

اہلِ ہمت کا کبھی بیجا نہ دیکھا اضطراب　　عینِ ہستی ہی بنا ہے موجِ دریا اضطراب
کیا ہمیں چلنا نہیں ہے جانبِ ملکِ عدم　　دم تو لے اے شرارِ جستہ اتنا اضطراب
مثلِ سیماب آگیا آخر پسِ کشتن قرار　　آرزوئے قتل ہی میں تھا وہ سارا اضطراب
بعدِ مردن ہو تو ہو اے پند گو یہ تجربہ　　عشق بازوں کو سکوں اچھا کہ اچھا اضطراب

کیا اُمیدِ زندگی اب آسیؔ بیتاب کی / جانگسل آزارِ اُلفت رُوح فرسا اضطراب

---

کیا تجھ سے طلب کرے یہ جانسوز / بس ایک نگاہ دو جہاں سوز
کس دشت میں عشق نے تھکایا / ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز
شعلہ بھی ہے کیا شبیہہ مجھ سے / ظاہر ۔ باطن ۔ نہاں عیاں سوز
وُہ اور تپِ فراق پوچھیں / جانا کہ یہ ذکر ہے زباں سوز
بُلبُل ہے کہ آسمانِ اندوہ / نالہ ہے کہ برقِ آشیاں سوز
ہم اور خموشی لے قیامت / گرمی جلوہ کی ہے فغاں سوز
ہر داغِ جگر ہے غیرتِ گُل / ہر آتشِ گل ہے گلستاں سوز
وُہ جانِ نزار آسیؔ زار / وُہ تابِ گدازِ غم ۔ تواں سوز

---

جب دلِ عاشق کو یارائے شکیبائی نہ تھا / حشر کا وعدہ کبھی طورِ دلآرائی نہ تھا
محوِ حیرت دیکھتا تھا اپنی آرائش کے ساتھ / آئینہ خانہ میں وُہ محوِ خود آرائی نہ تھا
اب وہی کچھیں دلِ شیدا میں کسکتی گل ہو / مبتلا کرنا سراپایانِ یکتائی نہ تھا
جو نہ بوجھ اُٹھا کسی سے وُہ اُٹھایا کس طرح / ضعفِ خلقی میں اگر جوشِ توانائی نہ تھا
رو کے آسیؔ پوچھتا تھا کہ قیامت آ گئی / کس طرح کہیے کہ وُہ تیرا تماشائی نہ تھا

---

یار سے کہیے کہ فرقت ہی تو فرقت بھی نہیں / اور نسبت میں ہی تمیز تو وصلت بھی نہیں
جو دیا تو نے وہ سب تیرے لئے کھو بیٹھے / ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں
بے نیازی بھی اُٹھا لوں میں تری ناز کی طرح / کیا وُہ طاقت نہ رہی مجھ میں تو ہمت بھی نہیں
زُہد و تقویٰ و صلاح و ورع و حسنِ عمل / کچھ نہیں مجھ میں مگر کیا تیری رحمت بھی نہیں

کبھی آسی سے ہم آغوش نہ دیکھا تجکو — اثرِ جذبِ دلِ اہلِ محبت بھی نہیں

---

بُتِ پندار جب اس میں سے جُدا ہوتا ہے — یہی دِل رُتبہ میں کعبہ سے سوا ہوتا ہے

غیر سے قطع نظر چاہیئے عاشق کے لئے — حاصلِ خلوت و بزم ایک مزا ہوتا ہے

دشمنِ جاں ہے اگر ہجر تو وصلت کیا ہے — قطرہ دریا میں جو ملتا ہے فنا ہوتا ہے

انہیں کانوں سے انا الحق کے سُنی ہیں دعوے — آدمی عشق میں کیا جانیئے کیا ہوتا ہے

غیر کو غیر جو کہیئے تو غلط ٹھہرا دے — اور جو کہیئے وہی ہے تو خفا ہوتا ہے

بیحجابی تھی پسند انکو ابھی کل کی ہے بات — آج پردہ میں ہیں پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

ہمتِ شیخ کی صیقل کی بدولت آسی — یہی دِل آئینۂ رُوئے خدا ہوتا ہے

---

لاکھ گلے لگائیں وُہ رنگ نہیں قرار کا — موجۂ بوئے گل ہُوں ہیں اُنکے گلے کے ہار کا

جوشِ بہار و سوزِ عشق اصل میں ایک شے ہیں — رنگ ہے لالہ زار میں سینۂ داغدار کا

محشرِ وعدہ آ ابھی بات ہے آسمیں بھید کی — خُون تو اپنے سر نہ لے کشتۂ انتظار کا

دِل کی کشود ہوتے ہی جلوہ بیحجاب تھا — دِل جسے سمجھے تُکمہ تھا بُرقعِ روئے یار کا

ایک نظر میں جو کرے دونوں جہان کو خراب — دِل ہے نظارہ جو اُسی آفتِ روزگار کا

آسیؔ نامراد پر بھی وُہی جلوہ جس سے ہے — مطلعِ آفتابِ حشر ذرّہ میرے غبار کا

---

خُدا سے تیرا چاہنا چاہتا ہوں — مِرا چاہنا دیکھ کیا چاہتا ہوں

جہانتک ہو تجھ سے جفا چاہتا ہوں — کہ مَیں امتحانِ وفا چاہتا ہوں

وُہ جب کھو چکے مجھ کو ہستی سے اپنی — تو کہتے ہیں اب مَیں ملا چاہتا ہوں

تمہارے سوا اب جو کچھ سُوجھتا ہو — پر اس سے بھی مَیں کچھ سوا چاہتا ہوں

جو دل میں تے چاہا تو کیا خاک چاہا — کہ دِل بھی تو بے مُدعا چاہتا ہوں

# سیرِ صبح

انوارِ صبح سے ہی عیاں شانِ سیرِ صبح گلہائے صبح ہیں سر و سامانِ سیرِ صبح
بیدار دل ہیں قائلِ فیضانِ سیرِ صبح الحق کہ کامگار ہے خواہانِ سیرِ صبح
ہنگامِ ذکرِ خالقِ لیل و نہار ہے
حیّ علی الفلاح کی ہر سو پکار ہے

وقتِ سحر سے خواب ہے دور از خردوری پنہاں ہے سیرِ صبح میں گنجِ خوش اختری
شاداب کیاریاں وہ چمن کی ہری بھری سوکھی ہے خشک پودوں کو بھی کیا ہری کری
ساغر کشانِ صبح ابھی مستِ خواب ہیں
تختے کے تختے کیاریاں سیرابِ آب ہیں

پودے وہ سبز سبز وہ شاداب کیاریاں پھولوں بھری ہیں صبح وہ سیراب کیاریاں
لب تشنہ ہیں جو منتظرِ آب کیاریاں بر لب ہیں یا مسبّب الاسباب کیاریاں
کیا ظرف تھا کہ اوک لگاتے ہی چھک گئیں
جھپکی پلک نہیں کہ یکایک چھلک گئیں

باہم وہ آب و خاک کی اللہ رے کشش دم بھر میں دیکھتے ہیں تو سب صاف بے خلش
ہر سمت آبیارِ چمن کی وہ سرزنش پانی کا گھوم گھوم کے آنا وہ ہر روش
جچتی نہیں ہے آنکھوں میں پٹری بلور کی
جدول کھنچی ہوئی نظر آتی ہے نور کی

تختے ادھر جو ہو گئے سیراب سر بسر پانی مڑا درختوں کے تختوں کی سمت ادھر
جل بھول پہ چھوٹی نہیں سب ابھی نظر آنکھوں میں گھومتی ہے وہ پانی کی رہگذر

# صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

اے ہمالہ تو چھپا لے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بیکلی اپنے نشیمن میں مجھے

مدتیں گذری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ! ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں!

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح!
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح!

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں!
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں!

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو؟

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں؟
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں؟

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا!
آہ! اس بستی میں اب میرا گذارہ ہو چکا!

پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک!
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک!

ہاں سلام آخری اے مولدِ گوتم[۱] تجھے!
اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے!

الوداع اے مدفنِ ہجویریِ[۲] اعجاز دم!
رخصت اے آرامگاہِ شنکر[۳] جادو رقم!

الوداع اے سیرگاہِ شیخ شیراز الوداع!
اے دیارِ بالمیک[۴] نغمہ پرداز الوداع!

الوداع اے سرزمینِ نانکِ شیریں بیاں!
رخصت اے آرامگاہِ چشتیِ[۵] عیسیٰ نشاں!

---

۱ یعنی گوتم بدھ ۔ ۲ سید علی ہجویری عرف حضرت گنج بخش ۔ ۳ سری شنکراچارج ہندوستان کا قدیم فلاسفر ۔ ۴ ہندوستان کا قدیم شاعر ۔ ۵ خواجہ معین الدین چشتی ۔

سر زمیں تیری قیامت کی نفاق انگیز ہے!
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے!

رمزِ الفت سے سرے اہلِ وطن غافل ہوئے
کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے!

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب!
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب!

اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انساں ہیں یہ!
غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں ہیں یہ!

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

جسکا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنیکو ہے!
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے!

دل حزیں ہے جاں رہینِ رنجِ بے اندازہ ہے
آہ! اک دفتر تھا اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے!

امتیازِ قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ!
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں یہ!

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی!
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے"

رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں!
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں!

وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی!
اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی!

ایک ہی مے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اقبال

# چاندنی رات

(از محمد حبیب الرحمن خاں حسرت شروانی رئیس بھیکن پور ضلع علی گڈھ)

چاندنی رات! تیرا کیا کہنا
تو نے پہنا ہے نور کا گہنا

چاند سے چار چاند تجھ کو لگے
منہ تیری ضو سے فق ہیں تارونکے

رخ روشن کا تیرے وہ جلوا
ماند جھومر پڑا ثریا کا

بزم عالم ہے تجھ سے نورانی
پھر گیا دن کی آب پر پانی

تجھ سے عالم میں نور ہے ہر سو
تیرے دم سے سرور ہے ہر سو

قصر گردوں میں روشنی تجھ سے
فرش خاکی پہ چاندنی تجھ سے

چشم عالم کا تو اجالا ہے
عیش کا تجھ سے بول بالا ہے

پاسبانی کا تیری وہ شہرا
یا تو پھیلا کے سوتی ہے دنیا

کیوں ہے تو روشن و خنک ایسی
چشمۂ نور سے ہے کیا نکلی

ہو مقابل اگر ضیا تیری
قلعی کھل جائے سنگ مرمر کی

تجھ سے شہروں میں رونق تازہ
چاندنی چوک ہر گلی کوچہ

جلوہ گر تجھ سے ہیں غیرت مہتاب
کوٹھے برج سپہر کے ہیں جواب

رشک فانوس نور کے وہ گلے
شمع بے نور جھکے دیکھ سے

موج زن ہے جو نور کا دریا
بقعۂ نور بن گیا صحرا

نور کی آبشار ہے جاری
بھر گئی آب سے زمیں ساری

چاندنی ہے یہ دشت میں پھیلی
یا کہ چاندی کی بہتی ہے ندی

کہتے دیتی ہے قلب کو مخمور
چاندنی ہے کہ ہے شراب طہور

جلوہ باغ ہے عجب دلکش
چاندنی کی بہار پر دل غش

نور سے چھلکا حوض کا ساغر — چادرِ آب نور کی چادر
شاہدِ گل پہ ہے عجب جوبن — نور کا ہے گلے میں پیراہن
جلوہ گر حسن اسکا ہے کم کم — اس کی محجوب ادا کا یہ عالم
خوابِ نوشیں میں ہو کوئی دلبر ق — آنچل آبِ رواں کا ہو منہ پہ
ہے یہ نقشہ سپید عمارت کا — کھایا ہے جوئے شیر میں غوطا
در و دیوار ہیں سراپا نور — جنسے شرمائیں آنکھیں ہوتی چور
بالاخانہ پہ ہے عجب جلوا — حسن بالائے حسن ہویدا
اک پلنگڑی پڑی ہے نازک سی — اس پہ چادر سپید سی ہے کسی
پتلے پتلے ہیں مخملی تکیے — پھول رکھے ہوئے چنبیلی کے
خوابِ راحت میں ایک مہوش ہے — جسکے جوبن پہ چاندنی غش ہے
رنگ پوشاک کا ہے کافوری — عطر میں کیوڑہ کے ہے جو بسی
چہرہ پر اک ادا قیامت کی — لبِ نازک پہ مسکراہٹ سی
کچھ پسینہ سے نم ہے پیشانی — چاند کے عکس سے ہے نورانی
ہے توجہ میں نور کا چشمہ — یا ابھرتا ہے سانس سے سینہ
ذرا نیچے کو جھک گیا ہے سر — ہاتھ رکھا ہے ایک تکیہ پہ
دوسرا ہاتھ اس کا سینہ پہ — پہرا بیٹھا ہوا خزینہ پہ
ایک دلدادہ محوِ نظارہ — اس کے پہلو سے ہے لگا بیٹھا
چہرہ پر اک سکوت کا عالم — ذرا نیچے کو سر ہے اسکا خم
نقشِ حیرت ہے شکلِ حسرت ہے — ہو بہو بیخودی کی مورت ہے
ہمہ تن محوِ لذتِ دیدار — سانس لینا بھی اسکو ہے دشوار
آنکھیں تابِ جمال سے ششدر — اور نگہ لوٹ رخ کے عالم پر

# کسی کا دھیان

آ دل میں آ میں نثار ترے اے کسی کے دھیان! — اس روح کی تو روح ہے اس جان کی ہے جان
تو جلوہ نہاں ہے کسی کے جمال کا — اے سینکڑوں دلوں کی خوشی! تجھ پہ میں فدا
سونا پڑا ہے دل کا شبستاں ترے بغیر — کیسے بسے یہ خانۂ ویراں ترے بغیر؟
ہے انتظار حسرتِ دیدار کو ترا — ارمان تک رہے ہیں تری راہ جلد آ
تو شمع ہے خیال کے فانوس کے لئے — روشن چراغِ فکر ہے تیرے ہی نور سے
ذرہ صفت ہے وہ اگر تو مہرِ خاوری — اس کی فسوں گری ہے تری ذرہ پروری
دیدارِ یار جامِ شرابِ طہور ہے — تو اس مئے لطیف کا پیارا سرور ہے
دوری تری جدائی جاناں سے کم نہیں — تو ہو تو مجھ کو یار کی فرقت کا غم نہیں
اس دل کا غم بھی تو ہی ہے اور غمگسار بھی — اس کی تڑپ بھی تو ہی ہے اس کا قرار بھی
خلوت کا تو انیس ہے جلوت کا تو رفیق — ہر حال میں تو ساتھ ہے اے باوفا شفیق
کیا تجھ سے نوک جھوک ہے کیا چھیڑ چھاڑ ہے! — ہے صلح بھی تجھی سے تجھی سے بگاڑ ہے
ہاں تیرے روٹھنے میں منانے میں لطف ہے! — اس دل لگی میں ہنسنے ہنسانے میں لطف ہے!
اپنے لئے جہاں سے الگ اک جہاں ہے تو — گلگشتِ شوق کے لئے باغِ جناں ہے تو
تو میری جاں کے ہر رگ و پے میں ہے موجزن — تو مجھ پہ ہے محیط تو میں تجھ میں ہوں مگن

یہ سر خدا کرے نہ ہو جب سر میں تو نہ ہو
وہ دن نہ ہو کہ دل میں تری آرزو نہ ہو

شیخ

حاشیہ۔ "خیالِ یار" ایک نہایت پیارا مضمون اور عجب دلکش عنوان ہے۔ دیر سے میری نظر اس پر تھی اور نہ صرف میری فہرستِ مضامین میں یہ درج تھا بلکہ جو کچھ مجھے اس کے بارے میں کہنا تھا اس کا ایک خاکہ بھی کچھ کھنچا ہوا موجود تھا۔ اسی اثنا میں میدانِ عمل میں نورالدین صاحب مجھ سے آگے نکل گئے اور انکی نظم اس عنوان سے مخزن میں چھپ کر نکل آئی۔ سوچا کہ اب اس کو جانے دوں۔ مگر پڑھ کر جو دیکھا تو ابھی کچھ نہ کچھ کہنا باقی تھا۔ انہی معنوں میں عنوان بدل کر عرض کیا گیا ہے۔

۱۶۰

# حالی

کوئی نہ تھا جو بنے ملکِ شعر کا والی — دکھائے جوہرِ فکرِ طبیعتِ عالی
پڑی تھی شاہدِ بزمِ سخن کی جا خالی — زمانہ دیر سے تھا منتظر ترا حالی

بیا کہ فرشِ رہت دیدہ ہائے مشتاقاں
نوائے نغمۂ تو جاں گدازِ غمناکاں

اُٹھا کے بربطِ بالینِ سعدیِ شیراز — پڑے ہوئے جسے گذرے تھے سالہائے دراز
گئے تھے جسکو بجانے کا بھول سب انداز — کچھ اس ادا سے ہوا اُس پہ تو ترانہ نواز

کہ آتے جاتے کو شیدا اپنا لیا تُو نے
فسوں سا خلقِ خدا پر چلا دیا تُو نے

جگر نشیں ہیں ترے تیرِ نالۂ موزوں — تری نوا میں چھپا برقِ قرار و صبر و سکوں
ہے زخم زخمہ پہ ایک ایک والہ و مفتوں — بطِ شراب میں ساقی نے گھول دی افیوں

کہ مستِ جامِ تو تنہا نہ مے گسار انند
"خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند"

ہیں حرف حرف میں تیرے چھپے ہوئے نشتر — ہیں لفظ لفظ میں گویا بجھے ہوئے خنجر
دل اسکا چھیدتے ہیں چاٹتے ہیں اُس کا جگر — ہوئی پکار کہ بزمِ طرب بنی محشر

"کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی"

صدائے رعد سے بھی تھے نہ چونکنے والے — شرابِ لذتِ خوابِ سحر کے متوالے
مگر اٹھائے جگر دوز تو نے جب نالے — توڑ گئے دلِ فولاد میں بھی تبخالے

ز خویشتن شد و یک تپاں تجا بر نجات
کہ شورِ صورِ سرافیل حالیا برخاست

ترا کلام ہے تفسیرِ دردِ اہلِ جہاں ہے شرحِ رازِ حقیقت ہر ایک تیرا بیاں
شعاعِ مہرِ معانی سے ہے ترا دیوان ضیائے مردمکِ دیدہ سخن دانان

ہمیشہ بزم میں باقی رہیگی ضو اُس کی
رہیگی زندہ دلوں کے دلوں میں لو اُسکی

غزل میں ہو وہ تصوف ہو ساز و سوز و گداز ہے مست صوفیِ صافی و رند محرم راز
دکھایا اُردو میں حافظ کا ہو بہو انداز بھرا ہے شیشۂ ہندی میں بادۂ شیراز

زلالِ چشمۂ حیواں ز خامہ ات بچکید
کہ رُوح در تنِ قومِ فسُردہ جاں بدمید

چمن میں طوطیِ ہندوستاں ہو گرم سخن کہاں ہے شورشِ آوازِ نالۂ بیرن
زبانِ ہند زبانِ جہاں اگر ہو جائے تری نواؤں سے تسخیر بحر و بر ہو جائے

---

زمینِ شعر میں تازہ چمن لگائے ہیں اور ان میں طرفہ مضامیں کے گل کھلائے ہیں
نگاہِ صادقِ مشتاق میں سمائے ہیں ہزار طرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں

نہ وُہ رہینگے زمانہ میں اور نہ تو حالی
رہیگی تیرے گلستاں میں رنگ و بُو حالی

(صادق علی خاں از سری نگر)

# اِنسانِ فانی

(از علی مردان شاہ قریشی المتخلص بہ مضطر)

نہیں معلوم مجھ کو کیا ہوں میں — راہ روِ منزلِ فنا ہوں میں
مَیں ہُوں لہو و لعب کا پیرایہ — مَیں ہُوں رنج و تعب کا سرمایہ
مایہ صد غرورِ باطل ہُوں — موردِ صد بلائے نازل ہُوں
معرضِ خطرہ ہائے فوت ہُوں میں — مظہرِ جلوہ ہائے موت ہُوں میں
شاہبازِ اجل کا صید ہُوں میں — پنجۂ سوزِ غم میں قید ہُوں میں
موت کے عرض کا میں جوہر ہُوں — صدفِ نیستی کا گوہر ہُوں
موجِ حسرت پہ اک حباب ہوں میں — سیخِ ماتم پہ اک کباب ہوں میں
میری ہستی کا شیشہ سنگِ فنا — ڈھونڈھتا ہے کہ ہووے اُس پہ فدا
ہے محلِ موت کا وجُود مرا — میری ہستی ہے نیستی کا پتا
میرے بازار میں متاعِ ہموم — میرے گلزار میں ہوائے سموم
مخمصات اور حادثات عجیب — ہیں مقدر میں میرے ہائے نصیب
مخیمِ غم ہے میری ہر شادی — میری آبادی جائے بربادی
رنج لازم ہے بعدِ ہر آرام — جیسے آغاز کے لئے انجام
دم ہی دم پہ ہے اب مدار اپنا — سخت موہوم ہے قرار اپنا
عدم آباد ہے ٹھکانا مرا — شہرِ خاموشاں آشیانہ مرا
کارواں میرے روز جاتے ہیں — لوٹ کر پر نہیں وُہ آتے ہیں
نہ صدائے جرس نہ شورِ درائے — نہ سراغِ قدم نہ نقشِ پائے

ہائے کیسا غضب ہوا ہے آج
چپکے لیٹے ہوئے ہیں کام نہ کاج
سر بالیں انہیں پکارتے ہیں
روتے ہیں رو کے چیخیں مارتے ہیں
پر توجہ نہیں ذرا بھی ادھر
دیکھتے بھی نہیں اٹھا کے نظر
تھے یگانے ہوئے ہیں بیگانے
کیا ہوا ہے - کوئی کیا جانے
نہ خیال انکو آہ و زاری کا
نہ ملال ان کو بیقراری کا
نہ تفکر ہے سود و نقصان کا
نہ تردد ہے درد و درماں کا
نہیں معلوم کیسے آنا ہوا
نہ کھلا بھید کیسے جانا ہوا
نہ تمنا یہاں تھی آنے کی
نہ خوشی تھی یہاں سے جانیکی

انتظامِ سفر رکھو مضطر
کہ نہیں کوچ کی ذرا بھی خبر

## اہلِ قناعت

بے مائگی سے غم کریں کیا اہلِ قناعت
رکھتے ہیں نظر سوئے خدا اہلِ قناعت
دنیا کے زر و مال کو کیا خیال میں لائیں
رکھتے ہی نہیں حرص و ہوا اہلِ قناعت
رہتے ہیں غنی فقر کی دولت سے ہمیشہ
خواہاں نہیں دولت کے ذرا اہلِ قناعت
جو آج فقیری میں رہے صابر و شاکر
کل پائینگے ہم سب سے سوا اہلِ قناعت
جاگیر توکلت علی اللہ کے مالک
ہیں منصبِ عالی پہ سدا اہلِ قناعت
اللہ نہ کیونکر رہے خوش ان سے ہمیشہ
ہیں مائلِ تسلیم و رضا اہلِ قناعت
درگاہِ خداوندِ دو عالم میں شب و روز
کرتے ہیں تہ دل سے دعا اہلِ قناعت
یاری کرے تقدیر چھٹیں قیدِ ہوس سے
ہو جائیں سب اے بخت رسا اہلِ قناعت

(سید امیر حیدر بخت - اکبر آبادی)

# کچکول

غیروں کو بھیجتے ہو عیادت کے واسطے    یہ اور آفتیں ہیں مری جان کے لئے
وہ مسکرا کے دیکھنا کافر نگاہ سے    اک تیر تھا کہ بیٹھ گیا جان کے لئے
سر رکھدیا ہے چھُو کے اُس نے جو دوش پر    مر مر گیا ہوں اتنے سے احسان کے لئے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

---

اک قیامت ہے بپا کیا دھوم ہے بیداد کی    تم نے تو صورت بدل دی عالم ایجاد کی
مر کے بھی لذت نہ بھولا میں تری بیداد کی    ہائے ظالم کیا روش تھی خنجر فولاد کی
ہمصفیروں میں کسے مہلت نہیں فریاد کی؟    اک ہمیں پر تیز رہتی ہے چھُری صیاد کی
چھانٹ کر مارے ہیں خنجر جانچ کر بیداد کی    عمر دو گنی چوگنی ہو اُس ستم ایجاد کی
دھیان تو ہو دل میں منہ سے نام لے وہ یا نہ لے    بھول جائیں بھی اُس کے اک جھلک ہو یاد کی
تم کہیں آتے تو ہم تک حشر ہوتا تو کہیں    کچھ تو ہم کو داد ملتی داد کی بیداد کی
عاشق و معشوق میں دو ہی کماں کا فرق تھا    عرش پر ایسی رسائی اور آدم زاد کی!
جب مزہ ہے زیست کا قید علایق میں نہ ہو    اس چمن میں زندگی ہے سرو سے آزاد کی
نزع کا عالم ہے پیارے دیدنی ہے زندگی    دیکھ جاؤ آ کے صورت عاشق ناشاد کی
یہ کہاں سے جھومتے آئے ان آنکھوں کے نثار    مر مٹا ہیں آپ نے اچھی روش ایجاد کی

( // )

---

میری بھی سُن لے۔ دامن رحمت دراز ہے    بندہ نیاز مند ہے تو بے نیاز ہے
جوش سرور بادہ پندار کیف حسن    کس کس نشے میں چُور مرا مست ناز ہے
جس طرح مجھ کو کہہ لیا محفل میں آپ نے    میں جانتا ہوں غیر بھی اس کا مجاز ہے

مانا کہ پاک صاف ہے دِل بھی تو پاک ہو
زاہد خُدا کے واسطے یہ کیا نماز ہے

اُس کا نصیب اُس کی ہی قسمت سے پوچھئے
شانے پہ جس کے یار کی زلفِ دراز ہے

آئینے میں دیکھتا ہُوں تصوّر سے یار کو
محمود آج آپ ہی اپنا ایاز ہے

لایا ہُوں سی کے پھر جگرِ زخم زخم کو
پھر اُن کو اپنی نیم نگاہی پہ ناز ہے

محبوب کو بلا لیا موسےٰ سے کھنچ گئے
شاعرؔ یہی تو شوخیِ ناز و نیاز ہے

(حضرت آغا شاعرؔ دہلوی)

---

سب کو سیراب کیا اک ہمیں ترسیں ساقی؟
ہاں ادھر بھی کوئی چھینٹا ملے میخواروں کو

مدتیں گذریں تڑپتے تری فرقت میں انہیں
پُوچھنے آؤ بھی ظالم کبھی غمخواروں کو

ساری باتیں گئیں دن رات کا جلنا نہ گیا!
بھر لیں ہم چیر کے پہلو میں نہ انگاروں کو؟

ہجر میں تیرے ہمیں چین کہاں خواب کہاں
تکتے رہتے ہیں پڑے سقف کو دیواروں کو!

دشتِ وحشت مری فرقت میں ہرا ہی بھرتا
آنکھیں تلووں سے ملیں شوق ہے یہ خاروں کو

ہر نفس ناصحا پھرتا ہے چمن آنکھوں میں
ضبط کس طرح سے ہو تازہ گرفتاروں کو!

(نذیر حسین بچھ)

---

میں اپنے ضعف کے ہاتھوں تڑپ نہیں سکتا
وُہ جانتے ہیں مرے دل کو اضطراب نہیں

وُہ میرے شکوہ پہ کہنا نقاب اُٹھائے ہوئے
نہیں نہیں مجھے تم سے کوئی حجاب نہیں

پیئے بغیر چڑھی رہتی ہے حسینوں کو
وہاں شباب ہے کیا کم اگر شراب نہیں

اُٹھی شباب کی آندھی تمہیں [illegible] ہو
تمہارے مُنہ پہ ٹھہرنے کی اب نقاب نہیں

غرور اُنکا جو ٹوٹا تو عاجزی سے مری
بجز نیاز کوئی ناز کا جواب نہیں

جلیل بند نہ ہو دورِ جامِ مینائی
کہ اس شراب سے بڑھ کر کوئی شراب نہیں

(شیخ محمد اکرام)
(جلیل جانشین امیر مینائی مرحوم)

---

اپنا دُکھڑا ہر گھڑی ہر جا نہ رونا چاہئے
حالِ دل کہنے کو اے ناداں سلیقہ چاہئے

شش جہت میں سینکڑوں جلوے کھڑے ہیں منتظر
ہاں درِ آئینۂ دل ہر طرف وا چاہیے

جیسے وہ آئینگے سب ظاہر ہے پر اے انتظار
کچھ نہ کچھ تو اپنے جینے کا سہارا چاہیے

جلوۂ دیدار - لطفِ ہم کلامی - ذوقِ وصل
اس دلِ بے صبر - ظالم! کو بھی کیا کیا چاہیے

محفلِ اغیار میں جاتے ہیں یہ آیا جواب
نا اُمیدی خط کو پڑھ کر آنکھوں پہ رکھا چاہیے

پھر چلے اُس بزم میں اے حضرتِ دل خیر ہے
شرحِ رمزِ خلد و آدم کیا دوبارا چاہیے

کچھ ہنسی ٹھٹھا نہیں اعجاز یہ تو عشق ہے
اس کو دل لوہے کا پتھر کا کلیجا چاہیے

(مرزا اعجاز حسین - بی اے)

---

ہے کلیجا فگار ہونے کو
دامنِ لالہ زار ہونے کو

کیا ادا تھی وہ جاں نثاری میں
تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لئے
خوب سمجھے شکار ہونے کو

عشق وہ چیز ہے کہ جسمیں قرار
چاہئے بے قرار ہونے کو

یارِ جانی کہیں نہیں ملتا
یوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

لالہ اور داغِ دل بہانہ ہے
دل جلوں میں شمار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو - توبہ!
کھل گیا بستہ کار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے
کس کی راہ کا غبار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ
ہے مجھے اعتبار ہونے کو

اُس نے پوچھا یہ کون چھپتا ہے
ہم چھپے آشکار ہونے کو

ہم نے اقبالؔ عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

(شیخ محمد اقبال ایم - اے)

---

آپ پیری و جوانی پہ نہ جائیں صاحب
دلِ عاشق کو بدستور دُبی دل سمجھیں

(منشی رحیم بخش صاحب ایم اے اسسٹنٹ)

اُلٹے وُہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
مانگا کرینگے اب سے دُعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
اللہ رے سوزِ آتشِ غم۔ بعد مرگ بھی — اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ
آتے ہی تیرے چلدیئے سب ورنہ یاس کا — کیسا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ
اللہ رے گمرہی بُت و بتخانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

(لیاقت حسین ہمسر) —— (مومن دہلوی)

بوستانِ آرزوئے دشمناں سرسبز ہے — نخلِ ارماں کو مرے نشو و نما کچھ بھی نہیں
وائے قسمت کب عیادت کے لئے آیا ہو وُہ — جبکہ بیمارِ محبت میں رہا کچھ بھی نہیں
دیکھیے تو ملکے خونِ بسمل کا اپنے ہاتھ میں — اس کے آگے شوخیٔ رنگِ حنا کچھ بھی نہیں
تخت! دیکھا؟ انقلابِ دہر کہلاتا ہے یہ — اُنکے آگے میں کبھی سب کچھ تھا، یا کچھ بھی نہیں

—— (سید امیر حیدر تخت)

شعلۂ عشقِ بتاں دل میں چھپا کر رکھا — ہم نے اس آگ کو چھاتی سے لگا کر رکھا
دردِ فرقت سے کبھی آہ نہ آئی لب تک — آگ کے ساتھ دھوئیں کو بھی دبا کر رکھا

(سید حفیظ الدین) —— (میر طالب حسین شائق مرحوم)

عشق میں مر ہم گئے لیکن کبھی اے چارہ گر — زخمِ دل اپنے ذرا واقف نہ مرہم سے ہوئے
یہ غضب دیکھو نہیں وُہ بھی ہمیں کہتے بھلا — واسطے جنکے بُرے ہم ایک عالم سے ہوئے

(سید محمد محسن) —— (ظفر)

پایا تو اُس کو ہم نے دل کے مکاں میں پایا — دَیر و حرم میں جب تھی جستجو ہماری
نازاں ہو غیر ناحق اپنی مصاحبت پر — رہتی تھی یوں ہی صحبت اُنسے کبھو ہماری
اُس گل کے تا بدامن پہنچے نہ اے صبا ہم — برباد خاک تو نے کی گو بکو ہماری

(درد) —— (درد)